افکار

(۱)

محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اپنے مقالہ "تحقیق ربوا" میں ربوا (سود) کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ "ادائیگی قرض کی مقررہ مدت میں تاخیر کے عوض میں راس المال پر اتنا اضافہ جس سے وہ اضعافاً مضاعفہ ہو جائے ربوا ہے" اور اضعافاً مضاعفہ ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ "سو کے اگلے سال دو سو اور اس سے اگلے سال چار سو اور پھر سولہ سو"

سو کے اگلے سال دو سو جس کا مطلب واضح ہے کہ شرح سود ۱۰۰ فیصدی ہے۔ اس سے اگلے سال دو سو سود کل چار سو ہوا۔ اس سے اگلے سال از روئے حساب چار سو اصل اور اس پر چار سو روپے سود یعنی کل آٹھ سو روپے ہونا چاہئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سولہ سو فرماتے ہیں۔ کیا حساب کی روشنی میں آپ کی یہ تعریف غلط اور مبالغہ آمیز نہیں ہے؟[1]

---

[1] آپ کا یہ اعتراض ہماری ربوا کی تعریف پر نہیں، بلکہ اس کی جو مثال دی گئی تھی اس کے صرف ایک لفظ "سولہ" پر وارد ہوتا ہے۔ اگر تضعیف کا عمل ہندسی (GEOMETRICAL) نسبت سے ہو تو "سولہ سو" ہی بنتے ہیں۔ لیکن اگر حسابی (ARITHMETICAL) نسبت سے ہو تو "آٹھ سو" ہوں گے، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے۔ ہم "سولہ سو" کی جگہ یہاں "آٹھ سو" ہی مان لیتے ہیں۔

۲۔ کیا ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ ربوا (سود) کی تعریف سے کوئی کم شرح والا سود ربوا کے زمرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ ہم امر واقع کے طور پر دیکھتے ہیں کہ کئی لوگ جنہوں نے پیسہ روپیہ ماہوار پر قرض لیا جو کہ ڈاکٹر صاحب کے ربوا (سود) کی شرح سے بہت کم ہے وہ سود کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ تباہ ہو گئے اور پونجی بھی گنوا بیٹھے۔ اگر ایسا سود بھی ربوا نہیں تو کیا حرمت ربوا بے معنی اور بے مقصد نہیں ہو جاتی؟[۲]

۳۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ بالا تعریف سے کسی بھی کم شرح کا سود ربوا شمار ہو سکتا ہے تو بینکنگ کا سود کیوں ربوا شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ سود بھی تو علامہ رشید رضا رح کے قول کے مطابق ایک طرف سرمایہ دار اور دوسری طرف مزدور پیدا کر کے امراء اور غربا کے مابین نفرت و عداوت کی خلیج حائل کر رہا ہے۔ اور دلوں سے نیکی دور کر رہا ہے چنانچہ علامہ اقبال رح نے فرمایا:۔

این بنوک این فکر چالاک یہود — نور حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد این نظام — دانش و تہذیب و دین سودائے خام[۳]

۴۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "قرآن کے نزدیک ربوا کی ضد صدقہ ہے ربوا اور صدقہ ایک تنی ہوئی رسی کے دو سرے ہیں تو بیع ان کے درمیان کہیں معلق ہے"

گزارش ہے کیا فزکس کے مطابق دو متخالف سمتوں کی طاقتوں سے رسی کے ٹوٹنے کا مقام ان طاقتوں کا حدِ فاصل متصور نہ ہو گا۔ یعنی کیا ربوا اور صدقہ کے درمیان وہی مقام حدِ فاصل نہیں جہاں ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس مقام سے انچ بھر بھی ادھر جائیں تو ربوا (سود) اور انچ بھر بھی اُدھر سرکیں تو صدقہ نہ ہو گا۔ اور کیا عین یہی مقام خالص بیع کا نہیں جس میں نہ صدقہ کی رعایت ہے نہ ربوا کا ظلم؟[۴]

۵۔ اگر ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ رسی کا ایک سرا ہی ربوا (سود) اور دوسرا سرا ہی صدقہ ہے تو کیا اس کا یہ

---

[۲] یوں تو پونجی گنوا بیٹھنے کے بہت سے ذرائع ہیں۔ لیکن محض اس سبب سے ان سب کو "ربوا" ہرگز نہیں کہا جائیگا۔

[۳] بنکاری کو سرمایہ دار اور مزدور کے طبقات پیدا کرنے اور امرا اور غربا کے مابین نفرت و عداوت کی خلیج حائل کرنے کا سبب قرار دینا درست نہیں۔ بالفرض اگر ایسا ہی ہے، تو اشتراکی ملکوں میں بنکوں کے وجود کے بارے میں چودھری صاحب کیا فرمائیں گے۔؟

[۴] "تنی ہوئی رسی" ایک استعارہ ہے، جسے فزکس کے اصولوں پر جانچنا کچھ ضرورت سے زیادہ سائنٹفک طرزِ فکر ہے۔

مطلب نہ ہوگا کہ دنیا میں نہ کوئی ربوا ہے اور نہ کوئی صدقہ۔ کیونکہ رسی کو تو ہم بے حد دراز کر سکتے ہیں یعنی ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ربوا تو وہ ہوتا ہے جو اصل سے لاکھ گنا بڑھ جائے اور صدقہ وہ ہوتا ہے جس میں پہاڑ کے وزن کا سونا دیا جائے۔ کیا اس سے ربوا اور صدقہ کی اصطلاحات بے معنیٰ بے مقصد اور کالعدم نہیں ہو جاتیں؟ ۵

۶۔ کیا اگر کوئی ایک پیسہ صدقہ دے تو وہ صدقہ نہیں اور اگر وہ صدقہ ہے اور یقیناً مسلّمہ طور پر صدقہ ہے تو ربوا کا ایک پیسہ کیوں ربوا نہیں؟ ۶

۷۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآن حکیم کی جس آیت پر اپنے مقالہ کی بنیاد رکھی ہے وہ ان کے اپنے قول کے مطابق یہ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوٰا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَّ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران ۳: ۱۳۰)

(وہ خود اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:) اے ایمان والو یہ دوچند سہ چند ہونے والا ربوا (سود) کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو امید ہے فلاح پاؤ گے۔

یہ آیت اور اس کا ترجمہ تشریح طلب نہیں بلکہ اپنا مطلب خود بیان کرتے ہیں میں اس میں کسی لفظ کے اضافہ بغیر سوال عرض کرتا ہوں:۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ شرح سود خواہ کتنی ہی کم ہو پھر بھی سود اپنے اصل سے دوچند سہ چند ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بڑھتا ہی رہتا ہے؟ یہ بات الگ ہے کہ اگر شرح سود زیادہ ہوگی تو وہ جلد دوچند سہ چند ہو جائیگا اور اگر شرح سود کم ہوگی تو ذرا دیر لگ جائے گی۔ لیکن اس کی دوچند سہ چند ہونے والی صفت میں تو کوئی امر مانع ہو ہی نہیں سکتا۔ ۷

---

۵ ہم "رسی کے ایک سرے ہی" کو ربوا اور "دوسرے سرے ہی" کو صدقہ بتانے کی غیر سائنٹفک غلطی ہرگز نہیں کرینگے۔ اس لئے یہ سائنٹفک سوال ہم پر وارد نہیں ہوتا۔

۶ یقیناً ربوا ہے، بشرطیکہ اس پر ربوا کی قرآنی تعریف صادق آتی ہو۔

۷ شرح منافع میں جس قدر دوچند سہ چند ہونے کی صفت موجود ہوگی، اُسی قدر زیادہ وہ ربوا کی قرآنی تعریف کے قریب ہوگی۔ اس بارے میں صائب رائے ریاضی کی ضرب تقسیم کے ذریعہ نہیں، بلکہ عقلِ سلیم (COMMON SENSE) کے الہام و تفہیم کے ذریعہ، قائم کی جا سکتی ہے۔

۸ - کیا قرآن حکیم جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے نیکی اور بدی کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ وہ خود ربوا (سود) جیسے اہم معاملہ کی نشان دہی اور حد بندی کرنے سے قاصر ہے اور اس کو لوگوں کے قیاسات پر چھوڑتا ہے؟[۵۸]

اگر قرآن حکیم ربوا (سود) جس کی وہ شدید ترین مذمت کرتا ہے کی نشان دہی اور حد بندی کرنے سے قاصر ہے تو اس کا بلند بانگ دعویٰ کیا ہوا؟

۹ - کیا یہ قرآن حکیم کی آیت نہیں کہ (ترجمہ) " اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو اور جو کچھ ربوا (سود) سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمھارے لئے تمھارے اصل مال ہیں"۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ - تمھارے لئے تمھارے اصل مال ہیں کیا اس آیت کا واضح طور پر یہ مطلب نہیں کہ تم صرف اپنے اصل مال کے حقدار ہو۔ اصل مال سے اگر ایک پیسہ بھی زائد لو گے تو وہ ربوا ہے کیا یہ ربوا (سود) کی واضح طور پر نشاندہی اور حد بندی نہیں کہ " اصل مال سے اوپر جو کچھ بھی ہے وہ ربوا ہے خواہ وہ ایک پیسہ ہے یا دو پیسہ؟"

کیا وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا میں ربوا (سود) کی مزید تشریح اور وضاحت نہیں کر دی گئی کہ جو کچھ بھی باقی ہے خواہ پیسہ ہے یا روپیہ اسے چھوڑ دو وہ ربوا (سود) ہے؟[۵۹]

۱۰ - فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ - تمھارے لئے تمھارے اصل مال ہیں۔ کیا اموال (یعنی ہر قسم کا

---

۵۸ یہی سوال ہمارا ہے۔ لیکن ہر جگہ اس سوال سے کام نہیں چلے گا۔ قرآنی احکام کا اپنا تاریخی پس منظر ہے جسے جاننا ان احکام کو سمجھنے کے لئے لازمی ہے۔ ۵۹ و ۱۰ زمانۂ جاہلیت میں ربوا کا ایک خاص نظام تھا جس کی نشاندہی ہم تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون میں کر چکے ہیں۔ یہاں اسی نظام کے تحت لئے ہوئے ربوا کا ذکر ہے کہ "جو کچھ بھی باقی ہے، خواہ پیسہ یا روپیہ اسے چھوڑ دو، وہ ربوا ہے"۔ اسی مخصوص جاہلی لین دین کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "تم صرف اپنے اصل مال کے حقدار ہو"۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "اصل مال سے اوپر جو کچھ بھی ہے، وہ ربوا ہے، خواہ وہ ایک پیسہ ہے یا دو پیسہ"۔ قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔ قرآن کے خلاف اسلئے ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جو جاہلی ربوا رائج تھا، قرآن نے اسکی مخالفت کی ہے، نہ کہ "اصل مال سے اوپر جو کچھ ہے"۔ اس کی عقل کے خلاف اس لئے کہ اگر یہ نتیجہ درست تسلیم کر لیا جائے تو پھیری میں دو پیسہ کمانے والے غریب کی روزی بھی ماری جاتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی "اصل مال سے اوپر جو کچھ ہے" کی زد میں آجاتی ہے۔ مزید دیکھئے صفحہ ۶۰، ۶۱، ۶۲ کے حواشی

مال) کا لفظ صاف یہ نہیں بتلاتا کہ ہر قسم کے مال میں ربٰوا (سود) ہوسکتا ہے۔ اور کسی قسم کے مال پر بھی تم زیادہ ستانی نہیں کرسکتے۔ وہ ربٰوا (سود) ہے جو قلیل بھی ہوسکتا ہے اور کثیر بھی؟ [۱۰]

۱۱- کیا بنکوں کا ربٰوا جس کا نام اب ڈاکٹر صاحب نے منافع رکھ لیا ہے یہ اپنے اصل مال سے اوپر نہیں اور کیا یہ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ کی خلاف ورزی نہیں؟ کیا یہ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا کی گرفت سے باہر ہے؟ اور کیا یہ دوچند سہ چند نہیں ہو رہا؟ [۱۱]

۱۲- کیا مندرجہ بالا آیات اپنا مطلب آپ بیان نہیں کرتیں؟ کیا ان میں کوئی ابہام، کوئی تشریح طلب امر یا کوئی تشنگی ہے کیا فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ اور وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (تمھارے لئے تمھارے اصل مال ہیں ربٰوا سے جو کچھ بھی باقی ہے اسے چھوڑ دو) کی روشنی میں صاف دکھائی نہیں دیتا کہ ربٰوا (سود) وہ ہوتا ہے جو اپنے مال یا اپنے مال کی مالیت سے زائد مال لیا جائے؟ نقدی (روپیہ) تو محض تبادلۂ اشیا میں سہولت پیدا کرنے کے لئے حکومت کا جاری کردہ سکہ ہے اس کی تو کوئی خاص ذاتی حیثیت ہی نہیں۔ اصل چیز تو اموال ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا ہے۔ جس میں مروّجہ سکہ بھی ضمناً شامل ہے۔ [۱۲]

۱۳- مندرجہ بالا بحث کو پڑھ کر آپ لازماً سوال کریں گے کہ کیا بٹائی کرائے منافع بھی ربٰوا ہیں۔ میرا جواب قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ ہے:-

فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (تمھارے لئے تمھارے اصل مال ہیں)

اگر آدمی کسی کو زمین دیتا ہے تو وہ اپنی زمین واپس لے سکتا ہے۔ ہاں بوجہ فصل لینے کے اگر زمین کی طاقت

---

[۱۰] بنکوں کے منافع کو عرب ممالک میں بھی "ربوا" نہیں، بلکہ "فائدہ" کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت بنک نہیں تھے۔ ان کے طریقۂ کاروبار کے بارے میں قرآن سے استنباط کرنے کے لئے مطالعہ و تحقیق غور و فکر اور بحث و نظر کی ضرورت ہے۔ ان کے بغیر محض لفظوں سے دھوکا کھانا درست نہیں۔ بقیہ سوالات کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ ماسبق (۹تا۱۱)

[۱۲] اس طرح تو ہر قسم کے بیوپار کی راہ مسدود ہو جاتی ہے اور یہ نہ قرآن و سنت کی رو سے روا ہے۔ نہ عقل اس کی اجازت دیگی۔

کمزور ہوگئی ہے تو اس میں کھاد ڈلوا سکتا ہے یا اس میں استعمال سے گڑھے پڑ گئے ہیں یا وٹ بندی کو نقصان پہنچا ہے تو اس کا معاوضہ لے سکتا ہے یا اسے ٹھیک کروا سکتا ہے۔ بلا محنت و مشقت مفت بٹائی خوری کس کا معاوضہ ہے کیا یہ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ کی حد سے تجاوز کرنا نہیں اور کیا دنیا میں یہی چیز بنیادی طور پر باعث فساد نہیں ؟ کیا یہی چیز مالک و مزارع کے دو طبقات پیدا کر کے ان کے درمیان بغض و حسد عداوت، لالچ اور مقابلہ کی آگ کو نہیں بھڑکا رہی ؟ ربوا کی بنیاد ہی بٹائی ہے ربوا پیدا ہی یہاں سے ہوتا ہے بنکوں میں تو ربوا (سود) کی محض خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اگر بٹائی ربوا نہیں تو دنیا میں کوئی بھی ربوا نہیں۔

لگے ہاتھ مولانا مودودی صاحب کی ربوا کی تعریف ملاحظہ فرمائیے اور اس کو بٹائی پر منطبق کر کے دیکھئے۔ صاحب موصوف اپنی کتاب "سود" حصہ اول صفحہ ۳۶ پر ربوا (سود) کی یوں تعریف کرتے ہیں:۔

"ربوا یہ ہے کہ ایک شخص اپنا راس المال ایک دوسرے شخص کو دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ میں اتنی مدت میں اتنی رقم تجھ سے راس المال پر زائد لوں گا۔ اس معاملہ میں راس المال کے مقابل راس المال ہے اور مہلت کے مقابلہ میں وہ زائد رقم ہے جس کی تعیین پہلے سے بطور ایک شرط معاملہ طے کر لی جاتی ہے اسی زائد رقم کا نام سود یا ربوا ہے جو کسی خاص مال یا شے کا معاوضہ نہیں بلکہ محض مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے"۔

اب اس تعریف کو بٹائی پر منطبق کر کے دیکھئے:۔

ربوا یہ ہے کہ ایک شخص اپنا راس المال (اپنی زمین) ایک دوسرے شخص کو دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ (بٹائی)

میں اتنی مدت میں اتنی رقم (اتنی پیداوار) تجھ سے راس المال (زمین) پر زائد لوں گا۔ اس معاملہ میں راس المال (زمین) کے مقابل

راس المال (زمین) ہے اور مہلت کے مقابلہ میں وہ زائد رقم (پیداوار) ہے جس کی تعین پہلے بطور ایک شرط معاملہ کے

کر لی جاتی ہے۔ اسی زائد رقم (پیداوار) کا نام سود یا ربوا (بٹائی) ہے جو کسی خاص مال یا شے کا معاوضہ نہیں بلکہ محض مہلت کا

معاوضہ ہوتا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کی پیش کردہ مندرجہ بالا سود کی تعریف کو دیکھئے اور اس پر بٹائی کے انطباق کو ملاحظہ کیجئے پھر سود اور بٹائی کی کیفیت ماہیت اور خواص پر غور فرمایئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ آیا ان میں کوئی فرق ہے۔ علی ہذا کرایہ کو پرکھ لیجئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ [۱۳]

۱۴۔ رہا منافع۔ کیا منافع اپنے اصل مال سے زائد لینا نہیں؟

آخر منافع کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ لین دین کے دوران دوسروں کی کمائی ہوئی دولت بلا محنت مشقت حاصل کر لی جائے؟ اگر منافع خوری اسلامی تعلیم ہے تو انفاق فی سبیل اللہ، دوسروں کی مدد امداد، ان سے تعاون، ہمدردی اور نیکی کی تعلیم کیا ہوئی؟ کیا منافع کے جواز سے وہ ساری تعلیم بے معنی بے مقصد اور کالعدم ہو کر نہیں رہ جاتی؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کا حکم دے، اور دوسری طرف منافع خوری کی اجازت بخشے؟ کیا دوسروں کی مدد، امداد تعاون اور صدقات و زکوٰۃ کا یہ مطلب ہے کہ پہلے لین دین اور خرید و فروخت کے دوران دوسروں کی کمائی ہوئی دولت کو منافع کے نام سے ہتھیا لیا جائے اور پھر اس میں سے کچھ احسان کے طور پر بخشش کر دی جائے؟ [۱۴]

---

[۱۳] بٹائی کو فقہ کی اصطلاح میں "مخابرہ" کہتے ہیں۔ ہم اپنے مضمون میں اس کی مذمت بہت واضح لفظوں میں کر چکے ہیں۔ اسی طرح مولانا مودودی کی تعریف ربوٰا سے ہم متفق نہیں اور اس سے اختلاف کرنے کی وجہ ہم اپنے مضمون میں بالتفصیل پیش کر چکے ہیں۔

[۱۴] نفع اندوزی یا منافع خوری جسے انگریزی میں PROFITEERING کہتے ہیں، یقیناً قرآن حکیم کی تعلیم صالحہ کی روح کے منافی ہے اور ہم نے اپنے مضمون میں اسے اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سوال بلکہ باقی تمام سوالات ہمارے مضمون پر وارد نہیں ہوتے، کیونکہ ہم نے اپنے مضمون میں بارہا قرآن حکیم کی باہمی امداد و تعاون کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ البتہ ہم اس معاملہ میں قرآنی طریقۂ امہال و تیسیر کے قائل ہیں۔ قرآنی اصولِ امہال کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم مہلت دیتا ہے اور اپنے احکام بتدریج نازل کرتا ہے۔ اصولِ تیسیر سے مراد یہ ہے کہ خدا اپنے بندوں کیلئے آسانی (یُسر) چاہتا ہے۔ وہ کسی ایسے حکم کے نفاذ کا طالب نہیں جس سے اس کی مخلوق کے معاش میں حرج واقع ہوتا ہو۔ اس کے برخلاف محترم چودھری صاحب کے سوالات میں انقلابی شدت اور انتہا کی انتہا پسندی ہے۔ بایں ہمہ ان کے خیالات سنجیدہ غور و خوض کے مستحق ہیں اور ان کی مخلصانہ سعی کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

۱۵۔ یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ جناب رسولِ اکرمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ منافع خوری کیا کرتے تھے؟ کیا یہ ان مقدس ہستیوں پر بہتان نہیں جنہوں نے اپنا مال و متاع اللہ کے راستے میں دے دیا اور کیا یہ اپنی منافع خوری کے جواز کے لئے محض ایک بہانہ نہیں؟

کیا یہ منافع خوری ہی نہیں جو دلوں میں نفرت، بغض و حسد اور مقابلہ کی خلیج حائل کر کے نیکی، ہمدردی اور تعاون کے جذبہ کو ملیا میٹ کر رہی ہے؟ کیا منافع میں جتنی دولت ایک آدمی کے پاس آتی ہے اتنی ہی دولت کی دوسرے مسلمان بھائیوں کے ہاتھ میں کمی واقع نہیں ہو جاتی؟ کیا منافع محض لین دین کے دوران ایک بھائی کی دولت کا دوسرے بھائی کے ہاتھ میں چلے جانے کا نام نہیں؟

۱۶۔ کیا جہاں منافع خوری کا سوال ہوتا ہے وہیں فساد اور بغض و عداوت، عدم تعاون، مقابلہ اور دیگر مختلف قسم کی برائیاں پیدا نہیں ہو جاتیں ایسی گندی اور بنائے فساد تعلیم کو قرآن حکیم کی طرف منسوب کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ یہ کہنا کہ اَحَلَّ اللّٰہُ البیع میں منافع خوری جائز ہے، کہاں کا انصاف ہے؟ اس آیت میں منافع کا لفظ کہاں ہے؟ کیا بیع کے معنی منافع ہے؟ اگر نہیں تو منافع کا لفظ اپنی طرف سے کیوں لگایا جاتا ہے؟ کیا یہ قرآن کی تعلیم کو مسخ کرنا نہیں؟ کیا قرآن حکیم نے غیر مشروط طور پر بیع کو حلال کیا ہے؟ کیا نیلامی اور دلالی والی بیع، لاٹری اور سٹے والی بیع احتکار، اکتناز اور محاقلہ، مزابنہ، والی بیع، بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ والی بیع، منڈی میں محض اشیاء کی رسد اور طلب کے عدم توازن سے ان کی قیمتوں میں گرانی اور ارزانی پیدا کرنے والی بیع، ادھار قسطوں والی، کمیشن اور ڈسکاؤنٹ والی بیع، منافع خوری اور سود والی بیع تجارتی رازوں اور ہتھکنڈوں، دکھلاوے، دھوکے، فریب اور اشتہار بازی والی بیع، یعنی یہ تمام بیوع جس پر مروجہ تجارت کا دارومدار انحصار ہے، یہ سب غیر مشروط طور پر حلال ہیں اور ان کے ذریعے منافع خوری جائز ہے۔ تو کیا اس سے ربٰوا کی حرمت بے معنی، بے مقصد اور کالعدم نہیں ہو جاتی اور قرآن حکیم کی اعلیٰ اور ارفع تعلیم پر پانی نہیں پھر جاتا؟ اگر یہ سب بیوع ناجائز ہیں تو منافع کیا ہوا؟

اگر منافع جائز ہوتا تو کیا اَحَلَّ اللّٰہُ البَیعَ کی بجائے اَحَلَّ اللّٰہُ المنافِعَ فِی البیعِ نہ ہونی چاہئے تھی اور حَرَّمَ الرِّبٰوا بالکل حذف نہ ہونا چاہئے تھا؟ اگر منافع کرایہ اور بٹائی خوریاں جائز ہوتیں تو ربٰوا (سود) کی حرمت کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

۱۷۔ کیا قرآن حکیم نے ان لوگوں کے جواب میں جو بیع اور ربٰوا کو یکساں سمجھتے تھے اَحَلَّ اللّٰہُ البَیعَ وَ

حَرَّمَ الرِّبٰوا کے الفاظ میں، بالکل صاف، واضح اور مُسکت جواب نہیں دے دیا کہ بیع حَرَّمَ الرِّبٰوا کی شرط کے ساتھ حلال ہے؟ یعنی بیع میں ربوا، بڑھوتری، منافع وغیرہ قطعاً نہیں ہوسکتا۔ صحیح، خالص، پاک اور بے عیب بیع صرف وہی ہوسکتی ہے جو ربوا کی میل کچیل سے پاک ہو۔ ہاں خرید و فروخت میں مال، اسباب اور اشیاء بنانے، لانے، لے جانے، مہیا کرنے وغیرہ کی جو محنت ہے اس کے مطابق قیمت خرید پر اضافہ ہوسکتا ہے۔ یا اشیاء کی صحیح مالیت معلوم نہ ہوسکنے کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں جو کمی بیشی ہوسکتی ہے وہ برداشت ہوسکتی ہے جو کہ بالکل جدا بات ہے۔

۱۸۔ دراصل مسئلہ ربوا (سود) میں الجھن ہی بٹائی، کرائے اور منافع وغیرہ ہیں۔ اگر یہ جائز رہیں گے تو مسئلہ ربوا کبھی حل نہیں ہوسکے گا۔ اور نہ ہی کسی قسم کے ربوا کو ختم کیا جاسکے گا۔ بٹائی، کرائے، منافع، انعام وغیرہ سب ایک ہی روح کے مختلف قالب ہیں۔ اگر یہ زندہ رہیں گے تو سارے کے سارے اور اگر مریں گے تو سب کے سب۔ ان میں سے آپ کسی ایک کو بھی نہ علیحدہ طور پر مار سکتے ہیں اور نہ زندہ رکھ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کی زندگی سب کی زندگی اور ایک کی موت سب کی موت ہے کیونکہ ان سب میں ایک ہی روح ہے۔ یہ اسلام کے دشمن اور اسلام ان کا دشمن ہے۔ ان کی بادشاہی میں اسلام نہیں رہ سکتا اور اسلام کی سلطنت میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیا قرآن حکیم کا صاف ارشاد نہیں (ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقوی کرو اور جو کچھ ربوا (سود) سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کرلو تو تمھارے لئے تمھارے اصل مال ہیں۔

۱۹۔ سود یا منافع بینکوں یا مارکیٹوں میں پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی وہاں سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ وہاں تو اس کی صرف خرید و فروخت ہوتی ہے اس کی پیدائش کا اصل مقام کھیت اور کارخانہ ہے۔ اور اس کی پیدائش کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبقہ کھیتوں اور کارخانوں کا مالک ہے اور دوسرا طبقہ نادار اور حاجت مند ہے۔ مالک طبقہ نادار طبقہ کو اپنے کھیتوں اور کارخانوں میں کام مہیا کرکے ان سے اپنے کھیتوں اور کارخانوں کے استعمال کا معاوضہ لے لیتا ہے۔ یہی دراصل ربوا، سود یا منافع ہے جس کی مارکیٹوں اور بینکوں میں فروخت ہوتی ہے۔ قرض پر دیا ہوا روپیہ بھی کھیتوں اور کارخانوں میں ہی منتقل ہو کر سود پیدا کرتا ہے۔

۲۰۔ اگر آپ سود کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اللہ اور رسول کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر کے ملت کے ہر فرد

کو ذرائع پیداوار مہیا کرنے کی فکر کیجئے۔ ربوا (سود) چھوڑنے اور باضابطہ نظام زکوٰۃ قائم کرنے سے یہ کام آسانی سے ہو سکے گا۔ زکوٰۃ کا یہ مطلب نہیں کہ ناداروں اور حاجت مندوں کو کھانا، کپڑا یا کچھ نقدی دے کر روانہ کر دیا جائے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ سے قومی کارخانے تعمیر کئے جائیں۔ اور ان کو امداد باہمی کے طریق پر چلایا جائے۔ ادر ادھر سود کو ختم کرنے کے لئے خود کاشت کی حد تک زمینوں کی ملکیت محدود کر کے زراعت کو بھی کوآپریٹو بنیاد پر قائم کیا جائے۔ ساتھ ساتھ تجارت کو بھی امداد باہمی کے طریق پر رائج کرنے سے سود کا مسئلہ بالکل حل ہو جائے گا۔ نظام زکوٰۃ شروع کرنے کے لئے پہلے اس روپے پر زکوٰۃ عائد کی جائے جو سود پر چڑھا ہوا ہے۔ اس طرح مالکان سرمایہ کو زکوٰۃ کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کی کمی کو سود پورا کر دیگا۔ سود کو ختم کرنے اور نظام زکوٰۃ کو باضابطہ قائم کرنے سے ملت کے ہر فرد کو ذرائع پیداوار مہیا ہونے کی ضمانت مل جائے گی۔ معاشی جرائم اور برائیوں کا خاتمہ ہو گا۔ رزق میں فراوانی ہوگی۔ ہر ایک آدمی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ اور معاشی فکر و غم سے نجات حاصل ہوگی جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

مروجہ نظام معاش سراسر ربوا (سودی اصول) پر مبنی ہے۔ پاکستان کو اگر صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانا ہو تو سودی نظام کو ختم اور نظام زکوٰۃ کو کما حقہٗ رائج کرنا لازمی ہے ورنہ مغربی تہذیب و تمدن کا چھا جانا یقینی ہے۔

(چودھری) محمد اسماعیل
خادم ادارۂ معیشت اسلامی
آئی ۷۶۹ مری روڈ۔ راولپنڈی شہر

(۳)

[رسالہ "بینات"، کراچی کی جنوری ۶۴ء کی اشاعت میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے مقالہ "تحقیقِ ربوا" پر تبصرہ کی پہلی قسط "فضل الرحمانی تحقیق ربوا کی حقیقت" کے عنوان سے چھپی ہے۔ کسی صاحب نے ابو اسامہ حسن العجمی کے اصلی یا فرضی نام سے یہ تنقید شائع کی ہے۔ اسے پیش کرتے ہوئے رسالہ کی مجلس ادارت کے ایک رکن غلام محمد صاحب نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے کہ "اس مضمون میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے مضمون 'تحقیق ربوا' کا فقرہ بہ فقرہ جائزہ لیکر اس کو تحقیق کی میزان میں تولا گیا ہے"۔ ہم اس تنقید کو ایک کالم میں اور دوسرے کالم میں ڈاکٹر صاحب کے مضمون کو شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ تحقیق کی میزان قارئینِ کرام کے سامنے آجائے۔

عجمی صاحب نے اپنی تحریر کا مقصد یہ بتایا ہے کہ "جس ذہنی کجی، علمی بددیانتی اور فنی بے اعتدالی کا مظاہرہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے ادارے کے اشتہاری پلندے (فکر و نظر) میں کیا ہے اس کو خالص علمی انداز میں قوم کے سامنے واضح کیا جائے تاکہ کل کسی حیلہ جو کو یہ حجت کرنے کی جرأت نہ ہو سکے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی برسہا برس کی عرق ریزی کے بعد سود کے جواز کے جس نتیجہ پر پہنچا اس کا کوئی رد پیش نہ کیا گیا"۔ عجمی صاحب کے "خالص علمی انداز" کا اندازہ اسی ایک عبارت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے قارئینِ کرام سے ندامت ہے کہ ہم ان کی خدمت میں ایک ایسی تحریر پیش کر رہے ہیں۔ جس کو ان کا ذوقِ لطیف قبول نہ کر سکے گا۔ لیکن ہمیں اپنے وعدے کو نبھانا ہے۔ علاوہ ازیں "بینات" کی یہ تحریر ہمارے ملک کے ایک موقر ادارے کی ترجمانی کی دعویدار ہے اس لئے ایک مخصوص حلقے میں اہمیت رکھتی ہے۔ ہم نے قارئینِ کرام کے احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس تبصرہ کے ابتدائی صفحات جن میں "پس منظر" کے عنوان سے ذاتیات کی گھناؤنی باتیں درج تھیں اور جن کا بہت ہی شستہ نمونہ مندرجہ بالا عبارت ہے، نقل نہیں کئے۔ بلکہ "برسرِ مطلب" کے عنوان سے آگے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ درجِ ذیل ہے۔

ہم نے اپنے حواشی میں کوشش کی ہے کہ ذاتی قسم کے حملوں کا مطلق جواب نہ دیں

بلکہ ان سے کامل اعراض برتیں۔ ہماری کوشش یہ بھی ہے کہ اصولی بحثوں میں بھی اپنی طرف سے تلخی نہ آنے دیں لیکن اگر ہم اپنی کوشش میں کما حقہٗ کامیاب نہ ہوئے ہوں تو اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ (مدیر)

تحقیق ربوا

(ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب)

(نوٹ:- فارسی زبان کا لفظ 'سود' قرآنی اصطلاح 'ربوا' کا مترادف نہیں ہے۔ اس فارسی لفظ کے لغوی معنی 'نفع' ہیں جس کا ضد 'زیان' ہے اور جس کا عربی مترادف ربح ہے۔ اس مقالے میں ربوا کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن قرآن کے اصطلاحی ربوا کا اردو، فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں ترجمہ کرنا راقم الحروف کے نزدیک نہ صرف سعی لاحاصل ہے بلکہ بنائے باطل بھی)

ربوایا ربا (مادہ: ر، ب، و) کے لغوی معنی ہیں: اگنا، نشو ونما پانا، جیسے

وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ۔ برسا دیتے ہیں تو وہ لہلہانے (الحج، ۲۲:۵) اور نشو ونما پانے لگتی ہے۔

بڑھنا (جیسے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي اللہ ربوا کو گھٹاتا اور صدقات الصَّدَقٰتِ (البقرۃ ۲:۲۷۶) کو بڑھاتا ہے۔

فضل الرحمانی تحقیق ربوا کی حقیقت

(ابو اسامہ حسن المجمی صاحب)

زیر تبصرہ مضمون ۴۹ صفحات پر حاوی ہے۔ اس سارے مضمون کا ماحصل اگر چند الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ ہوگا:-

"قرآن پاک میں سود کے احکام کے سلسلے میں اصل حیثیت نہ تو مکی دور کی پہلی آیت ربا کو حاصل اور نہ ان آخری آیات کو جو مدینہ میں نازل ہوئیں۔ بلکہ اصلی اہمیت درمیانی آیت" لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفہ" کی ہے جس میں اضعافا مضاعفہ کی شرط لگا کر دوگنے چوگنے سود کو حرام کیا گیا ہے۔ احادیث اس سلسلے میں ناقابل اعتبار ہیں۔ ان میں تناقض تضاد، مفروضے، ارتقائی کرشمے، من مانے اضافے اور من گھڑت افسانے شامل ہیں۔ رہ گئی فقہ تو جس کی عمارت ہی ایسی ناقص (نعوذ باللہ۔ نقل کفر کفر نباشد) احادیث کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہو وہ بھلا کہاں قابل التفات ہو سکتی ہے۔ اور چونکہ اضعافا مضاعفہ کی تفسیر کرتے ہوئے بعض مفسرین نے بعض مقامات پر یہ بھی لکھا

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا — اور جو مال ربوا میں لگاتے
لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ — ہو کہ لوگوں کی دولت میں جاکر
فَلَا يَرْبُوا عِندَ اللَّهِ — بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک
(الروم، ٣٠:٣٩) — یہ بڑھوتری نہیں ہے۔

ابھرنا (جیسے

وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ — اور ہم نے ان دونوں کو ابھری
(المومنون، ٢٣:٥٠) — ہوئی جگہ یعنی ٹیلے پر پناہ دی
كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ — کسی باغ کی مثل جو کسی ٹیلے
(البقرة، ٢:٢٦٥) — پر ہو۔

پھولنا (جیسے

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا — پھر سیلاب پھولی ہوئی جھاگ
(الرعد، ١٣:١٧) — کو بہالے گیا)

پالنا پرورش کرنا (جیسے

ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا — جس طرح ان والدین نے مجھے
(بنی اسرائیل، ١٧:٢٦) — صغرسنی میں پالا پوسا اور بڑا
کیا تو اسی طرح تو ان پر رحم کیجو)

أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا — کیا ہم نے تجھے بچپن میں نہیں

ہے کہ سود بڑھتے بڑھتے دوگنا چوگنا ہو جاتا تھا اس لئے جو سود اصل زر سے بڑھ کر دوگنا چوگنا ہو جائے وہ حرام ہے اور اگر نہ ہو تو پھر حلال۔ موجودہ بینکوں کا سود چونکہ خالص معاشی اصول کے مطابق کم سے کم ہوتا ہے اس لئے جائز ہے اور اس کا نام ربوا نہیں بلکہ نفع ہے[1]۔"

اپنے مقالہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی دانست میں سب سے زیادہ زور ربوا کی "جامع اور مانع" تعریف متعین کرنے میں صرف فرمایا ہے۔ آپ نے آیات سود پر بحث کرتے ہوئے ان کی "تاریخی ترتیب کی روشنی میں" یہ فیصلہ کیا ہے کہ تحریم کے سلسلے کی آیات میں سورۂ آل عمران کی آیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں ربوا کی بنیادی علت اضعافا مضاعفا (کذا) (چند در چند ہونا) بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے طبری کے حوالے سے مشہور تابعی مفسر قرآن حضرت مجاہد سے بیان کردہ روایت پیش کی ہے کہ یہی چند در چند ہونے والا سود ربا، جاہلیت تھا۔

---

[1] مندرجہ بالا پیراگراف کو واوین (INVERTED COMMAS) میں دیکر عجمی صاحب نے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا اقتباس ہے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ درمیان عبارت میں پہلے تو احادیث کے لئے خود ہی لفظ "ناقص" استعمال کیا، پھر خود ہی اسے کفر قرار دیکر الزام ڈاکٹر صاحب کے سر ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے قوسین (BRACKETS) میں کہا کہ "نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد"۔ معلوم نہیں یہ سب معاملہ "بینات" کے محترم سرپرست کی نظر سے گزرا یا نہیں۔ اور اگر گزرا ہے تو ہم حیران ہیں کہ انہوں نے کن دینی اور علمی مصلحتوں کے پیش نظر

وَلِيداً (الشعراء، ۲۶: ۱۸ پالا؟)
زیادتی، بڑھوتری کسی قسم کی۔ (جیسے
فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَّابِيَةً۔ (الحاقة، ٦٩: ١٠) پھر ان پر بڑی سخت گرفت ڈالی۔
أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (النحل، ١٦: ٩٢) ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے طاقت میں بڑھ چڑھ گیا ہے۔

ربوا کے اصطلاحی معنی انہیں حقیقی لغوی معنوں سے ماخوذ ہیں جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔ اس مقالے میں اولاً ہم اس ربوا کی ماہیت پر روشنی ڈالیں گے جس کی ممانعت قرآن حکیم میں آئی ہے، دوسرے حصے میں ہم ان فقہی احادیث سے بحث کریں گے جن کی رو سے قرآنی ربوا کو وسعت دیکر اس کا اطلاق مبادلہ اور معاملات کی مختلف شکلوں پر کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم اس لئے بھی ضروری ہے کہ جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ ربوا کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ ایک کو ربا القرآن کہا گیا ہے اور دوسرے کو ربا الحدیث یا ربا الفضل۔

عن مجاهد فی قول الله عز وجل یا ایها الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفة قال ربوا الجاهلية [۲]

لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو انھیں مجاہد کا یہ قول سورۂ بقرہ کی آیات ربوا کی تفسیر کے سلسلے میں نظر نہ آیا کہ

عن مجاهد قال فی الربا الذی نهی الله عنه کانوا فی الجاهلية یکون لرجل علی رجل الدین فیقول لك کذا وکذا فتؤخر عنی فیؤخر عنه۔ — حرام کردہ ربوا کے بارے میں مجاہد سے روایت ہے کہ جاہلیت میں ایک شخص کا دوسرے شخص پر قرض ہوتا تو وہ کہتا کہ میرے اوپر تیرا اتنا اتنا ہے مجھے مہلت دے پس دی جاتی

(اور اس مہلت پر سود لیا جاتا۔)

ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ روایت جس کو ان کے ترجمے کے کرشمے نے نئے معنی پہنائے ہیں [۳] صرف ایک جگہ حضرت مجاہد سے منقول ہے لیکن موخر الذکر روایت دو مختلف اسناد سے مروی ہے۔ پھر تیسرے مقام پر بھی یہ مجاہد

---

[۲] و [۳] توکیا عجمی صاحب یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ان کی طرح حضرت مجاہدؒ کی یہ روایت بغیر ترجمے کے نقل کر دیتے تاکہ عربی نہ جاننے والے مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے میں ان جیسے اصحاب کامیاب رہیں؟ حضرت مجاہدؒ کی روایت بہت صاف اور واضح لفظوں میں ہے۔ اور عربی سے معمولی شُدبُد رکھنے والا بھی جان سکتا ہے کہ اس روایت کی رو سے قرآنِ حکیم کی اصطلاح ربوا کا اطلاق محض اَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً ہو جانے والے جاہلیت کے ربوا پر ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصے میں ہم مختصراً یہ بتائیں گے کہ موجودہ معاشی نظام میں بینک کے منافع (INTEREST) کا کیا مقام ہے۔ اور خاتمہ میں ہم ان مباحث کے نتائج پیش کریں گے۔

(۱)

ربوا اور قرآن

ربوا کے بارے میں قرآن حکیم کا سب سے پہلا ارشاد یہ ہے :-

وما آتیتم من ربًا	اور جو مال تم ربوا میں لگاتے
لیربوا فی اموال	ہو تاکہ لوگوں کی دولت میں
الناس فلا یربوا	جاکر یہ بڑھ جائے تو اللہ کے
عند اللہ وما آتیتم من	نزدیک یہ بڑھوتری نہیں
زکوۃ تریدون وجہ اللہ	ہے۔ ہاں البتہ جو زکوٰۃ تم

ہی کا قول ہے :-

عن مجاھد (فنظرۃ الی میسرۃ) قال یؤخرہ ولا یزد علیہ وکان اذا حل دین احدھم فلم یجد ما یعطیہ زاد علیہ واخرہ۔

مجاہد سے فنظرۃ الی میسرۃ الایۃ (مہلت تا وقت سہولت) کی تفسیر میں مروی ہے کہ مدت بڑھا دو اور اضافہ مت کرو۔ اور ہوتا یہ تھا کہ جب کسی شخص کے قرض کی مدت پوری ہو جاتی اور وہ قرض واپس نہ کرتا تو اضافہ کر دیا جاتا اور اس پر مہلت میں توسیع کر دی جاتی۔

یؤخرہ ولا یزد علیہ — مہلت دو اور بڑھاؤ مت اس پر[۴]

بات صرف مجاہد کی ہی نہیں ہے۔ اسی پائے کے دوسرے مفسر قتادہ سے مروی ہے کہ ربا جاہلی یہ تھا کہ ایک شخص مدت مقررہ کے لئے دوسرے سے کچھ خریدتا جب

---

[۴] ربوا کے بارے میں حضرت مجاہد رح سے جتنی روایتیں طبری نے نقل کی ہیں ان میں سے صرف وہ روایت جسے ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا ہے، جاہلیت کے ربوا کی تفصیل بتاتی ہے اور اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ جاہلیت کے ربوا کی شرح کیا تھی۔ بقیہ روایتیں جنہیں اب عجمی صاحب نے نقل کر دیا ہے مجمل ہیں اور صرف یہ بتاتی ہیں کہ ربوا قرض کی ادائیگی میں تاخیر کے عوض راس المال پر اضافہ کی شکل میں ہوتا تھا۔ اس کی پوری پوری وضاحت موطا امام مالک کی حضرت زید بن اسلم رح والی روایت سے ہو جاتی ہے جسے ڈاکٹر صاحب اپنی بحث کے آغاز ہی میں پیش کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۷) اس لئے حضرت مجاہد رح کی ان روایتوں کو جن میں اسی مضمون کو نسبتاً اختصار کے ساتھ دہرایا گیا ہے، نقل کرنا سراسر عبث تھا۔ یہ اضافہ کس شرح پر ہوتا تھا؟ یہ سوال سارے مسئلے کی جان ہے۔ اس کا جواب اس روایت (زیر بحث) میں درج ہے جس کا ترجمہ کرنے سے عجمی صاحب شرماتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب سے ناراض ہیں کہ انہوں نے اس کا ترجمہ کیوں پیش کر دیا۔

فاولئک هم المضعفون   دیتے ہو کہ اللہ کی خوشنودی
(الروم، ۳۰: ۳۹)   حاصل ہو تو یقیناً اللہ کی راہ
میں خرچ کرنے والوں کی دولت
دوچند سہ چند ہوتی ہے۔

یہ آیت سورۂ روم کی ہے جس کے تمام تر مکی ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔ (ملاحظہ ہو امام سیوطی رح کی 'الاتقان فی علوم القرآن'، مطبع موسویۂ مصر، ۱۲۷۸ھ۔ ج ۱، ص ۱۱ تا ۲۲)۔ اس کی ابتدائی آیات کی داخلی شہادت اس امر پر دال ہے کہ یہ بعثت

وقت مقررہ پر رقم ادا نہ کرسکتا تو اس (قرض) میں اضافہ کیا جاتا اور مدت بڑھا دی جاتی۔

پھر اسی ام التفاسیر میں یہ بھی مروی ہے کہ

ان التحریم من اللہ فی   آیت میں سود اس کے
ذالک کان بکل معانی   ہر ہر معانی میں حرام ہے۔[5]
الربوا

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ خبر کہ

لعن اللہ آکل الربوا و   اللہ کی لعنت ہے سود کھانے
موکلہ وکاتبہ وشاھدیہ   کھلانے، لکھنے اور گواہی دینے

۵؎ یہ جملہ تفسیر طبری (مطبوعہ دار المعارف، مصر) جلد ۶ صفحہ ۱۱ تا ۱۲ کی ایک عبارت سے ماخوذ ہے لیکن مواخذۂ اخروی سے قطعاً بے پرواہ ہو کر اس میں تحریفیں کی گئی ہیں۔ وہ عبارت جس سے یہ جملہ لیا گیا ہے کسی صحابی یا تابعی کی روایت نہیں ہے کہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ "اسی ام التفاسیر میں یہ مروی ہے"۔ بلکہ یہ عبارت ایک مفروضہ سوال کا طبری کی طرف سے جواب ہے۔ عبارت یوں شروع ہوتی ہے:۔

فان قال لنا قائل: أفرأیت من عمل ما نهی اللہ عنہ من الربا فی تجارتہ ولم یأکلہ أیستحق هذا الوعید من اللہ؟ قیل: نعم۔

"اگر کوئی اگر ہم سے کوئی شخص کہے کہ تجارت میں ربوا کا بیوپار کرتا ہو لیکن خود ربوا کھاتا نہ ہو (یعنی ربوا کی رقم اپنے استعمال میں نہ لاتا ہو) تو کیا وہ بھی اللہ کی وعید کا سزاوار ہے؟" تو اس سے کہا جائیگا کہ "ہاں"۔

آگے چلکر اپنی تائید میں آیت وذروا ما بقی من الربوا سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ

ان التحریم من اللہ فی ذلک کان بکل معانی الربوا وانّ سواءً العمل بہ واکلہ واخذہ واعطاؤہ   اللہ کی طرف سے ربوا کی تمام معنوں میں حرمت آئی ہے اور اس حرمت میں ربوا کا بیوپار، اس کا کھانا، اس کا لینا اور دینا سب برابر ہیں۔

سیاق وسباق عبارت سے اس جملہ کو علیحدہ کرکے اس سے استدلال کرنا یحرفون الکلم عن مواضعہ کا مصداق ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا یوسف بنوری صاحب جیسے متقی و محترم عالم دین نے اسکی اجازت کیسے دی۔ ان سے حسن ظن رکھتے ہوئے ہم یہ باور کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سب ان کی

کے چوتھے، پانچویں سال یا اس سے بھی قبل اتری ہے۔ کیونکہ ادنیٰ الارض (عرب کے قریبی ملک) یعنی ارض شام و فلسطین میں ایرانیوں کے ہاتھوں رومیوں کی شکست جس کا ذکر ان آیات میں ہے، ۶۱۱ء (سنہ ۱ نبوی) سے شروع ہوئی اور ۶۱۴ء (سنہ ۴ نبوی) میں زوال (سقوط بیت المقدس) کے بعد اپنے اوج پر پہنچی۔ (ملاحظہ ہو گبن (GIBBON) کی تاریخ زوال و

والوں پر۔ ؎

اور پھر اسی ام التفاسیر میں ضحاک کی وذروا ما بقی... الخ کے سلسلے میں یہ روایت کہ

کان ربا یتبایعون به فی / زمانۂ جاہلیت میں خرید و فروخت
الجاهلیة فلما اسلموا / میں بھی ربوٰا کا معاملہ ہوتا تھا
امروا ان یاخذوا رؤس / پس جب وہ ایمان لائے تو حکم دیا
اموالهم۔ / گیا کہ (صرف) راس المال لیں ؎

؎ قرآنِ حکیم نے جس ربوٰا کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ قرار دیا ہے یقیناً اس کے کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے اور گواہی دینے والے سب اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ میں شریک قرار پا جائیں گے۔ جو لعنت سے بھی بدرجہا بدتر شئے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ربوٰا، وہ مہیب جرم کیا ہے؟ آیا بنکوں پر اس کا اطلاق ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو کیا بنکوں میں حساب جمع کرانے والے اس جرم بغاوت میں برابر کے شریک ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس حدیث میں یقیناً نہیں ہے۔ پھر اسے یہاں نقل کرنے سے کیا فائدہ مقصود ہے جبکہ یہاں ربوٰا کی مذمت زیر بحث نہیں ہے بلکہ ربوٰا کی ماہیت زیر غور ہے؟ اور ربوٰا کی مذمت سے آخر کس مسلمان کو انکار ہے؟ اس کی حرمت تو ایک بدیہی امر ہے۔ لیکن اس کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے۔ ؎ جب جاہلیت کے ربوٰا کو قرآن نے حرام قرار دیا تو اسے ترک کرنے کے بعد تو سوال صرف یہ رہتا تھا کہ قرض خواہ مقروض سے اپنا اصلِ زر بھی واپس لے یا نہ لے قرآن نے اصل زر (راس المال) واپس لینے کی اجازت یہ کہکر دی کہ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (اگر تم توبہ کرلو تو راس المال تمہارا ہے) لیکن قرآن کی نگاہ میں یہ بھی ایک رعایت تھی کیونکہ وہ تو دراصل نظامِ صدقہ کا داعی ہے۔ اس لئے اس نے اسی سلسلۂ آیات میں آگے چلکر کہا ہے کہ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (اور اگر تم راس المال بھی صدقہ کردو تو تمہارے لئے بہتر ہے) ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں قرآنی نظام معیشت میں صدقے کی مرکزی حیثیت کو بخوبی واضح کر دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ صرف راس المال واپس لے لینے یا اسے بھی مقروض کو صدقۃً دے دینے کے احکام سے یا اس مضمون کی روایتوں سے جاہلیت کے ربوٰا کی حقیقت اور جس ربوٰا کو قرآن نے حرام اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ قرار دیا ہے، اس کی ماہیت کیونکر معلوم ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصد جیسا کہ وہ مقالہ کے شروع میں بتا چکے ہیں اس ربوٰا کی حقیقت کو سمجھنا اور اس فہم کی روشنی میں موجودہ اقتصادی حالات کا جائزہ لیکر راہِ عمل متعین کرنا ہے۔ ربوٰا سے متعلق مختلف روایات کا مجموعہ مرتب کرنا ہرگز ان کا مقصد نہیں ہے۔

سقوط سلطنت روما HISTORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE باب ۴۶)۔ ربوا کی مذمت کا قرآن کی اتنی ابتدائی آیات میں نازل ہونا تعجب کی بات نہیں بلکہ ایسا نہ ہونا سخت حیرت انگیز اور قرآن کی حکمت بالغہ کے منافی ہوتا۔ قرآن کی مکی سورتیں اپنے زمانے کے مکے کے غیر منصفانہ معاشی نظام کی مذمت، اس وقت کے امراء کی نفع اندوزی اور بخل پر زجر و توبیخ، اور بنیادی تجارتی خرابیوں (مثلاً کم تولنے، کم ناپنے) کی ممانعت سے پُر ہیں، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ربوا جیسی بڑی خرابی پر تنبیہ نہ کی جاتی؟ یہ ضرور ہے کہ اس وقت تک اسلام کو وہ اقتدار نہیں حاصل ہوا تھا جس سے اس برائی کا مکمل سدباب کیا جاتا اور اس مقصد کے پیش نظر اس کی حرمت کا اعلان کیا جاتا۔ اسی لئے قرآن حکیم نے اس مکی آیت میں ربوا کی صرف

یہ تمام کی تمام روایات اسی تفسیر طبری میں جگہ جگہ موجود ہیں جس کو ام التفاسیر تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی انصاف پسندی اور خوش عقیدگی کا ڈھنڈورہ پیٹا ہے، ہم یہ دریافت کرنے کی جرأت کریں گے کہ آخر اس قدر روایات کے ہوتے ہوئے آپ نے اپنی ایک آنکھ کیوں بند کر لی تھی۔ ربوا کے ساتھ راس المال کا معاملہ جہاں جہاں آیا ہے اگر ڈاکٹر صاحب اس کو بھی پیش فرما دیتے تو یقیناً اس تحقیقی ٹکنیک کا مقصد فوت ہو جاتا جس کے حصول کے لئے وہ عیسائی مشنریوں کا اپنے آپ کو دست نگر قرار دیتے ہیں۔ آخر سمجھ میں نہیں آتا کہ وذروا ما بقی من الربوا سے ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ کیسے نکالا کہ قرض دار صرف ربا بالا قساط ادا کرتا رہتا تھا پھر بھی وہ "ربوی سود" ادا نہ کر پاتا تھا[۵]۔ اور اصلی ممانعت اس لمبے چوڑے سود کی ہے کیونکہ یہ اضعافاً مضاعفاً (کذا) ہو جاتا تھا حالانکہ اگر ذرا سی تکلیف فرما کر ڈاکٹر صاحب

---

۵ جواب کے لئے تفسیر طبری جلد ۶ کے صفحات ۲۲ تا ۲۴ ملاحظہ کیجئے جن کا خلاصہ ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۷۹ پر درج کر دیا ہے۔ عجمی صاحب کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن مولانا یوسف بنوری جیسے حدیث کے عالم کے بارے میں تعجب ہے کہ انہوں نے وذروا ما بقی من الربوا والی آیت کی شانِ نزول والی روایات سے قطع نظر کر کے بلکہ ان کے برخلاف اس سے استناد کیسے روا رکھا؟ ان کا اور ان کے نو ساتھیوں کا سارا زور اسی آیت پر ہے۔ حالانکہ اس کی شانِ نزول کی روایت کی روشنی میں اس سے ڈاکٹر صاحب کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مزید ملاحظہ ہو حاشیہ ۷ (ماسبق) اور ۹ (مابعد)

اخلاقی بے وقعتی اور اس کے مقابلے میں صدقات کی اللہ کے نزدیک مقبولیت، کا ذکر کیا۔

ہجرت مدینہ کے بعد جب اسلام کو اقتدار ملا تو ربوا کی حرمت کا اعلان مدنی سورہ آل عمران کی اس آیت میں کیا گیا۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا	اے ایمان والو یہ دو چند سہ چند
الربوا اضعافا مضاعفۃ	ہوتے والا ربوا کھانا چھوڑ دو اور
واتقوا اللہ لعلکم تفلحون	اللہ سے ڈرو۔ امید ہے کہ
(آل عمران، ۳: ۱۳۰)۔	فلاح پاؤ گے)۔

اس کے بعد اسی ممانعت کا اعادہ شدید تاکیدی الفاظ میں جن کے ساتھ تہدید بھی شامل ہے، سورہ بقرہ کی آیات ۲۷۴ تا ۲۸۰ میں کیا گیا۔ آیات یہ ہیں:۔

الذین یاکلون الربوا لا	جو لوگ ربوا لیتے ہیں اور اس
یقومون الا کما یقوم الذی	سے اپنا پیٹ پالتے ہیں وہ
یتخبطہ الشیطان من	کھڑے نہیں ہو سکیں گے
المس ذالک بانھم	مگر اس آدمی کا سا کھڑا ہونا
قالوا انما البیع مثل الربوا	جسے شیطان کی چھوت
واحل اللہ البیع وحرم الربوا	نے باؤلا کر دیا ہو۔ یہ اس لئے
فمن جاءہ موعظۃ من	ہوگا کہ انہوں نے ربوا کے
ربہ فانتھی فلہ ما	ناجائز ہونے سے انکار کیا
سلف وامرہ الی اللہ ومن	اور کہا کہ خرید و فروخت
عاد فاولئک اصحاب	کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے
النار ھم فیھا خالدون	ربوا کا لین دین۔ حالانکہ

طبری ہی کی وہ تمام روایتیں ملاحظہ فرما لیتے جو اس کے بعد کی آیت وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم الخ کے سلسلے میں بیان ہوئی ہیں تو کیا قاضی آسمتہ گاکر جاتا۔ یہ ہیں وہ روایتیں ۔

ان تبتم فترکتم اکل الربوا	اگر تم نے توبہ کی سود کھانا چھوڑا
وانبتم الی اللہ عز وجل	اور اللہ کی طرف پھرے تو
فلکم رؤس اموالکم	تمہارے لئے راس المال
من الدیون التی لکم	ہے، تمہارے ان قرضوں
علی الناس دون الزیادۃ	کا جو تم نے دے رکھے ہیں اور
التی احدثتموھا علی	یہ بغیر اس زیادتی کے ہوگا جو تم
ذالک ربا منکم۔	نے اس پر لگا رکھی ہے ربوا قرار دیکر

بروایت قتادہ:۔

المال الذی لھم علی	ان کا جو مال لوگوں کے اوپر
ظھور الرجال جعل لھم	واجب ہے، جب یہ آیۃ
رؤس اموالھم حین	نازل ہوئی تو ان کیلئے صرف
نزلت ھذہ الآیۃ۔ اما	راس المال کو برقرار رکھا اور
الربح والفضل فلیس	نفع اور زیادتی کے متعلق فیصلہ
لھم ولا ینبغی لھم	کیا کہ وہ ان کا نہیں اور ان میں سے
ان یاخذوا منہ شیئا	کچھ بھی لینا ان کے لئے جائز نہیں

بروایت ضحاک:۔

وضع اللہ الربا وجعل لھم	اللہ تعالیٰ نے سود کو اٹھا دیا
رؤس اموالھم	اور ان کے لئے راس المال
	برقرار رکھا۔

یمحق اللہ الربوا ویربی	خرید و فروخت کو تو خدا نے	قتادہ کا دوسرا قول :۔	
الصدقات واللہ لا	حلال ٹھہرایا ہے اور ربوا کو	ما کان لھم من دین	ان کے قرضوں کے لئے یہ حکم وارد
یحب کل کفار اثیم	حرام۔ سو اب جس کسی کو اس کے	فجعل لھم ان یاخذوا	ہوا کہ وہ اپنا اصل زر لے
ان الذین آمنوا وعملوا	پروردگار کی یہ نصیحت پہنچ	رؤس اموالھم ولا	لیں اور ان پر کچھ بھی زیادہ
الصالحات واقاموا	گئی اور وہ آئندہ ربوا لینے	یزدادوا علیہ شیئا۔	نہ لیں۔
الصلوۃ وآتوا الزکوۃ لھم	سے رک گیا تو جو کچھ پہلے لے	سدی سے مروی ہے :۔	
اجرھم عند ربھم ولا خوف	چکا ہے وہ اسی کا ہو چکا ہے	الذی اسلفتم وسقط	صرف وہ جو تم نے قرض دیا
علیھم ولا ھم یحزنون	اس کا معاملہ خدا کے حوالے	الربوا۔	اور ربا ختم۔ [۹]
یا ایھا الذین آمنوا	ہے، لیکن جو کوئی باز نہ آیا تو	اور تو اور خود ڈاکٹر صاحب کو زید بن اسلم سے جو اثر	
اتقوا اللہ وذروا ما بقی	وہ دوزخی گروہ میں سے ہے	منقول نظر آیا وہ وہی تھا جس میں دوگنا چوگنا سرمایہ	
من الربوا ان کنتم مؤمنین	ہمیشہ عذاب میں رہنے والا۔	ہو جانے کی بشارت ہے حالانکہ انہیں زید بن اسلم	
فان لم تفعلوا فاذنوا	اللہ ربوا کو مٹاتا اور صدقات	سے عین اسناد کے انہیں ساتھ فلکم رؤس	
بحرب من اللہ ورسولہ	کو بڑھاتا ہے۔ اور تمام ایسے	اموالکم الخ کے ضمن میں جو اثر مروی ہے وہ	
وان تبتم فلکم رؤس	لوگوں کو جو نعمت الٰہی کے	صاف الفاظ میں یہ ہے کہ نہ تو تمہارے مال میں	
اموالکم لا تظلمون	ناسپاس گزار اور نافرمان	کچھ کم کیا جائے اور نہ تم وہ باطل مال لو جو تمہارے	

---

[۹] مکرر عرض ہے کہ قرآن حکیم کے نزدیک اصل سوال مقروض سے صرف راس المال لینے کا نہیں بلکہ اسے سارا قرض بخش دینے کا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایسا نظام معیشت قائم کرنے کا ہے جس میں قرض لینے کی نوبت ہی نہ آئے اور آجکل کے حالات میں ہمارے نزدیک یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسلامی رفاہی تعاونی دولت مشترکہ ISLAMIC WELFARE CO-OPERATIVE COMMONWEALTH قائم ہو، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مقالے میں واضح کر چکے ہیں۔ اس مثبت تجویز کے سلسلے میں علمائے کرام کو بزم فکر و نظر میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن مقام تاسف ہے کہ اس محترم طبقے کی طرف سے اب تک صرف عجمی صاحب ہی بولے ہیں اور وہ تقریباً اس طبقے کے خود ساختہ ترجمان ہیں۔

ولا تظلمون وان کان ذوعسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ وان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعلمون

ہیں اللہ کی پسندیدگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے کام بھی اچھے ہیں نیز نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں تو بلا شبہ ان کے پروردگار کے حضور ان کا اجر ہے۔ تو ان کیلئے کسی طرح کا ڈر ہو سکتا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔ اے ایمان والو اگر فی الحقیقت تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس سے ڈرو اور

لئے حلال نہیں ہے۔ لاتنفقون من اموالکم ولاتاخذون مالا لایحل لکم [۱۰] اور امام طبری نے صرف روایتیں یکجا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان مختلف روایتوں سے جو نتیجہ عقل سلیم قبول کر سکتی ہے اسے نکال کر پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

باخذکم رؤس اموالکم التی کانت لکم قبل الارباء علی غرمائکم منھم دون ارباحھا التی زدتموھا ربا علی من اخذتم ذالک منہ من غرمائکم لم یکن لکم قبل ولا الغریم الذی یعطیکم ذالک دون الربا الذی کنتم الزمتموہ

---

[۱۰] حضرت زید بن اسلم رح کی دو روایتیں ڈاکٹر صاحب نے نقل کی ہیں ایک تو وہ جسے امام مالک رح نے اپنے مؤطا میں درج کیا ہے (ملاحظہ ہو صـــ) اور دوسری وہ روایت جس میں بالکل کھلے لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ انما کان الربا فی الجاھلیۃ فی التضعیف ("بیشک جاہلیت میں ربوا صرف تضعیف میں تھا") (ملاحظہ ہو صـــ) حضرت مجاہد رح کی تفسیر اوپر گزر چکی جسے عجمی صاحب ترجمہ کرنے سے گھبراتے ہیں جن کی مزید تاکید حضرت زید بن اسلم رح کی مندرجہ بالا واضح روایت سے ہو رہی ہے اور تاکید مزید ذروا مابقی من الربوا کی شان نزول والی روایت ہو رہی ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ عــ) اتنی روایتوں کی موجودگی میں مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا مفتی محمد شفیع کی خاموشی قابل فہم ہے لیکن عجمی صاحب بھلا کیوں خاموش رہیں؟ وہ حضرت زید بن اسلم رح کی ایک تیسری روایت اس طرح نقل کر رہے ہیں جیسے اس سے دوسری روایتوں کی تکذیب ہوتی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ ظاہر ہے اس تیسری روایت میں صرف یہ کہا گیا کہ لاتنفقون من اموالکم ولاتاخذون باطلا لایحل لکم ("نہ تو تم اپنے مال میں سے خرچ کرو نہ تم وہ باطل مال لو جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے") ہم حیران ہیں کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ جاہلیت کے ربوا کی اصل اس کا اضعافا مضاعفۃ ہونا نہیں تھا یا یہ کہ بینک انٹرسٹ ربوا ہے۔

جس قدر ربوا مقروضوں کے ذمے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ اور اگر اس سے توبہ کرتے ہو تو پھر تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو اور ربوا چھوڑ دو نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے اور اگر ایسا ہو کہ مقروض تنگدست ہے تو چاہئے کہ اسے فراخی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے۔ اور اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے بہتری کی بات تو یہ ہے کہ اس کا قرض بطور خیرات بخش دو۔

سیاق عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیات تحریم ربوا کے سلسلے کی آخری آیات ہیں۔ بعض روایات میں اس امر کو وسعت دیکر کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کی آخری آیتیں ہیں جو نازل ہوئیں، اور یہی بات اور زیادہ پھیل کر حضرت عمرؓ کی طرف یوں منسوب ہوئی کہ ربوا کی تحریم کا حکم سب سے آخر میں ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد زیادہ عرصہ اس دنیا میں

من اجل الزیادۃ فی الاجل نبحسبکم محضا لکم علیہ فیمنعکموہ لان مازاد علی رؤس اموالکم لم یکن حقا لکم علیہ فیکون بمنعہ ایاکم ذالک ظالما لکم۔

ڈاکٹر صاحب دوگنے چوگنے کو لئے پھرتے ہیں حالانکہ کلام الٰہی تو غریبوں کے لئے (ان تصدقوا خیر لکم (اگر صدقہ کر دو تو تمہارے لئے اور بھی اچھا ہے) کا حکم سناتا ہے۔ قتادہ، ضحاک، ابراہیم اور الربیع کی روایات ملاحظہ فرما کر غور کریں۔ سدی نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ حضرت عباس رضؓ نے یہ آیت سن کر غریب مقروض پر قرض کا صدقہ کر دیا[11]

اصلی مشکل تو یہ ہے کہ فاضل ڈاکٹر صاحب نے ان، حتمی اور فیصلہ کن آیات ہی کو شہید کر دیا جس کی بنیاد پر اتنی صاف اور واضح ہدایات مل سکتی تھیں اور آپ نے اپنا سارا زور مغز اس آیت سے مجاہدہ کرنے میں ضائع کر دیا۔ جس میں ایک فقرہ اضعافاً مضاعفاً کا ان کی من مانی تاویلات، روایات کی قطع و برید احادیث کی کتر بیونت اور علما کی طعن و تشنیع کا بہترین موقع فراہم کر سکتا تھا[12] پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے القرآن یفسر بعضہ بعضا کے مسلمہ اصول کی بنا پر ربا القرآن کو سمجھنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے اس میں ہیں شروع سے

---

[11] لیکن کیا اس سے یہ لازم آئیگا کہ اگر حضرت عباسؓ مقروض کو اس کا قرض صدقہ کے طور پر نہ دیدیتے تو وہ ربوا ہو جاتا؟

[12] یہی وہ آیت ہے جس میں ربوا کی حرمت کے لئے علت الحکم اور جاہلیت کے ربوا کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور یہی آیت تحریم ربوا کے سلسلے کی آیات کی بنیادی کڑی ہے

تشریف فرما نہ رہ سکے کہ آپ اس کی پورے طور پر وضاحت فرما دیتے کہ ربوا میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں۔ لہٰذا ہم کو نہ صرف ربوا بلکہ ربیہ (یعنی جن پر ربوا کا شک ہو) سے بھی بچنا چاہیئے۔ ان روایات کا جائزہ ہم اس مقالے کے دوسرے حصے میں لیں گے۔ یہاں "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" (قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر بیان کرتا ہے) کے مسلمہ اصول کی بنا پر ربا القرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

قرآنی آیات کے اس سلسلے کی بنیادی کڑی سورۂ آل عمران کی آیت ہے۔ سورۂ الروم کی آیات تحریم ربوا کی اسی آیت کے لئے بطور تمہید تھیں اور سورہ البقرہ کی آیات اسی کا تتمہ اور تکملہ۔ ان تمام آیات کو ان کی تنزیل کی ترتیب میں دیکھنے سے یہ باتیں واضح ہوتی ہیں:-

(و) ربوا ایک ایسا جاہلی معاشی نظام تھا۔ جس میں سود در سود کے طریق عمل سے راس المال کی مقدار اضعافاً مضاعفہ یعنی دوچند سہ چند بڑھ جاتی تھی۔ (ب) اس چند در چند سود کے عمل کی وجہ سے قرآن نے ربوا کو عادلانہ تجارتی کاروبار کی ایک قسم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ (ج) قرآن تاجرانہ منافع کو حلال قرار دیتے ہوئے نفع اندوزی کے جذبے کے برخلاف صدقات کی امداد باہمی کی روح کو ترقی دینا چاہتا ہے۔

تاریخی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے قرآن حکیم کے ان ارشادات کو سمجھنے اور جس ربوا کے خلاف اس کی وعیدیں ہیں ان کی حقیقت کو جاننے میں مدد ملتی ہے آخر تک کہیں یہ پتہ نہ چل سکا کہ انہوں نے اضعافاً مضاعفا (کذا) والی آیت کو کس طرح قرآن ہی کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس کے برعکس ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کے بجائے ان آیات سے بھی روگردانی کر رہے ہیں جو اس معاملے سے براہ راست متعلق ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ یہ کہ کر سورۂ روم اور سورہ بقرہ کی آیات سے منہ موڑتے ہیں کہ:

"قرآنی آیات کے اس سلسلے کی بنیادی کڑی سورۂ آل عمران کی آیت ہے۔ سورۂ روم کی آیات (بصیغۂ جمع) تحریم ربوا کی اسی آیت کے لئے بطور تمہید تھیں اور سورۂ البقرہ کی آیات اسی کا تتمہ اور تکملہ ہیں"؛ ص ۵۷

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ان آیات کو "ان کی تنزیل کی ترتیب" میں ملاحظہ فرماتے ہیں اور ان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ

و - ربا ایک ایسا جاہلی معاشی نظام تھا جس میں سود در سود کے طریق عمل سے راس المال کی مقدار اضعافاً مضاعفا (کذا) یعنی دوچند سہ چند بڑھ جاتی تھی۔

ب - اس چند در چند سود کے عمل کی وجہ سے قرآن نے ربا کو عادلانہ تجارتی کاروبار کی ایک قسم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ج - قرآن تاجرانہ منافع کو حلال قرار دیتے ہوئے نفع اندوزی کے جذبے کے برخلاف صدقات کی امداد باہمی کی روح کو ترقی دینا چاہتا ہے۔ (ص ۵۷)

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تنزیل کی ترتیب میں دیکھنے کے دعوے کے بعد بغیر کسی دلیل یا بحث و تمحیص کے

موطا امام مالک رح میں حضرت زید بن اسلم رح سے مروی ہے کہ: کان الربا فی الجاهلیة ان یکون للرجل علی الرجل الحق الی اجل فاذا احل الحق قال أتقضی أم تربي؟ فان قضاه اخذ والا زاده فی حقه وزاده الآخر فی الاجل۔ (مؤطا، کتاب البیوع نمبر ۳۸)

یعنی "جاہلیت میں ربوا یہ تھا کہ کسی شخص کا کسی دوسرے پر قرض کسی مدت کے لئے واجب ہوتا تو جب مدت ختم پر آتی تو قرضخواہ قرض دار سے پوچھتا کہ تم ادا کروگے یا بڑھاؤگے؟ اگر وہ ادا کر دیتا تو وہ وصول کر لیتا ورنہ اپنے قرض کی رقم میں اور قرضدار کی مہلت ادائیگی میں اضافہ کر دیتا۔"

مودودی صاحب کا قیاس یہ ہے کہ پہلی مدت کے لئے قرض بغیر سود کے دیا جاتا تھا (ملاحظہ ہو "سود" مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۲۰۸ حاشیہ نمبر ۲) لیکن مکہ جیسے تجارتی شہر میں یا مدینے جیسے یہودی معاشرے میں جہاں سودی کاروبار ایک عام بات تھی ان کے اس قیاس کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ سو کے دو سو اور پھر اگلے سال چار سو کرنے والے سود خوار پہلی مرتبہ کا قرض محض حسبةً للّٰہ دیدیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مودودی صاحب کے اس قیاس کے برخلاف مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ کہنا ہے کہ "عرب میں اس کا اکثر رواج اس طرح تھا کہ ایک معین رقم معین مدت کے لئے، معین

وہ کس طرح ان نتائج پر جا پہنچے[۱۳] پچھلے تیرہ سو سال میں ایک سے ایک جلیل القدر مفسر محدث فقیہ اور مفکر اس مظلوم امت نے پیدا کئے ہیں لیکن ان میں کوئی اللہ کا بندہ سود کی اس نئی قسم سے خبردار نہ ہو سکا۔ آخر قرآن کی وہ کونسی آیت ہے جس میں راس المال کی مقدار دو چند سہ چند ہوتی بتائی گئی ہے۔ اور آخر قرآن کی کس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ربوا کو چند در چند سود کے عمل کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے اور اگر چند در چند نہ ہو تو پھر حلال ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ چھوڑیئے اس بحث کو جن میں ربا کو علی الاطلاق حرام قرار دیا گیا ہے۔

خود آیت لاتاکلوا الربوا اضعافًا مضاعفا (کذا)[۶] سے بھی وہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا جس کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اتنے پاپڑ بیلے ہیں۔

لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفا (کذا)[۶]	مت کھاؤ سود ڈبل ڈبل چند در چند زیادہ سے زیادہ دوگنا، چوگنا وغیرہ۔

آخر اس آیت میں یا اس پوری صورت میں بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ پورے کلام الٰہی میں اصل زر کے دگنے چوگنے ہونے کا مفہوم کہاں سے پیدا ہو رہا ہے۔ نحوی تاویلات مان لی جائیں تو اضعافا مضاعفا (کذا)[۶] کو حال اور ربوا کو ذو الحال قرار دیا جائیگا اور یہ ترکیب صرف سود کے دوگنے چوگنے ہونے پر دلالت کریگی جیسا کہ آج کل

۱۳ھ کتاب مبین کسی دلیل یا بحث وتمحیص کی محتاج نہیں۔ آیات کو ان کی تنزیل کی تاریخ کی روشنی میں پڑھئے تو معاملے کی صورت واضح ہو جائیگی۔

مقدار سود پر دیدی جاتی تھی۔ قرض خواہ (کذا) نے اگر میعاد مقررہ پر واپس کردی تو مقررہ سود لیکر معاملہ ختم ہوگیا اور اس وقت واپس نہ کرسکا تو آئندہ کے لئے مزید سود کا معاملہ کیا جاتا تھا۔" ("مسئلہ سود" مطبوعہ کراچی، سنہ ۱۳۸۱ھ، ص ۹ تا ۱۰)۔ لیکن مندرجہ بالا اثر سے، جسے امام مالک رح کے علاوہ بیہقی، رزین، اور دوسرے ائمہ حدیث وفقہ نے بھی نقل کیا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی مدت کا یہ سود ربوا نہیں سمجھا جاتا تھا، ربوا راس المال میں اضافہ تھا جس سے چند الٹ پھیر میں اصل زر کئی گنا ہوجاتا تھا۔ واقعہ یہ نظر آتا ہے کہ ابتداءً کچھ رقم مقررہ میعاد تک کے لئے سود پر قرض دی جاتی۔ میعاد کے اختتام پر اگر قرض دار رقم ادا نہ کرسکتا تو بنیادی قرض یعنی راس المال میں کافی اضافہ ہو رہا ہے یعنی اگر پہلے سال ایک شخص سو روپے کے قرض پر چھ روپے ادا کرتا ہے تو دوسرے سال بارہ روپے ادا کریگا تین سال میں اٹھارہ دینا پڑیں گے اور چار سال میں چوبیس اس طرح ہر سال چھ کا پہاڑہ دوہرایا جائیگا۔ اور سود کی رقم پہلے سال کے مقابلہ میں دوگنی چوگنی پانچ گنی ہوتی چلی جائیگی وقس علی ہذا لیکن یہ تو سود مفرد میں ہوگا۔ آجکل تو ڈاکٹر صاحب کی دعاؤں سے سود مرکب لگایا جاتا ہے۔

دوسری ترکیب کی رو سے اضعافا مضاعفا (کذا)[9] مفعول مطلق ہے اور الربا کے اسم خاص کا مفعول مطلق اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ اسے متخصص باللام کیا جائے ایسی صورت میں یہ لاتاکلوا کے محذوف مصدر اکلاً کا مفعول مطلق قرار پائیگا اور اس کے معنی ہمارے روزمرہ میں یہ ہونگے کہ "اے ایمان لانے والو حلق تک سود مت بھرو" "ڈٹ ڈٹ کر سود مت زہر مار کرو"[14] اور

---

[14] سارے مضمون میں مضاعفۃً کو مضاعفا لکھنے کے بعد ترکیب نحوی کی دعوت دینا بڑی جسارت ہے۔ ہم اس غلطی کو کاتب غریب کے سر ڈال کر عجمی صاحب کے بارے میں حسن ظن رکھتے لیکن جب دس جگہ ایک ہی غلطی دہرائی جائے تو ہم اسے کتابت کا سہو سمجھنے سے معذور رہیں۔ (ہم نے ان مقامات کی نشان دہی کرنے کے لئے مضاعفا کے آگے کذا یعنی SIC کا نشان بنا دیا ہے۔ دسواں مضاعفا اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)۔

بہرحال، اس آیت میں الربوا کو حال اور اضعافا مضاعفہ کو ذوالحال قرار دینا قرآن کی بلاغت سے انکار کے مترادف ہے کیونکہ ربوا کے معنی ہی بڑھنے کے ہیں اس کیلئے اضعافا پھر مضاعفۃ کی تکرار محض حشو قبیح ہوگی جو قرآن درکنار معمولی بلاغت کی رو سے بہت بڑا عیب ہے۔ اسلئے اضعافا مضاعفۃً کو صرف مفعول مطلق ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ رہی قرآن حکیم کے ترجمے میں اردو روزمرہ کی فقرہ بازی، تو اس کی جرأت عجمی صاحب ہی کرسکتے ہیں۔ آیت لاتاکلوا الربا اضعافا مضاعفہ کی جو تفسیریں اور تاریخی شہادتیں ڈاکٹر صاحب تابعی مفسروں کی روایتوں سے نقل کرچکے ہیں ان کی موجودگی میں اس آیت کے دوسرے معنی فرض وہ اصحاب پہنا سکتے ہیں جو ان روایات کے منکر ہوں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ان روایات سے انکار کے بعد جاہلیت کے ربوا کی شرح کا تعین اور اس کی تاریخی حیثیت کا کوئی سراغ باقی نہیں رہے گا۔ اور شرح کی تعیین کے بغیر ربوا کی حرمت کا حکم بے معنی نظر آنے لگے گا۔

کرکے مدت ادائیگی میں توسیع کردی جاتی۔

تحریم ربا کے سلسلے کی آخری یعنی سورہ بقرہ کی آیات میں سے آیت "ذروا مابقی من الربوا الایۃ" (باقی ماندہ ربوا چھوڑ دو) سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آتے رہتے تھے کہ جہاں بڑی رقمیں قرض پر دی گئیں تو قرضدار صرف ربوا بالاقساط ادا کرتا رہتا تھا پھر بھی وہ ربوی سود ادا نہ کر پاتا تھا۔ راس المال کی واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ طبری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو مغیرہ کی طرح بعض قبیلے کے قبیلے سودی قرض کے بار سے دبے ہوئے تھے اور اسلام لانے کے بعد ان کا اپنے قرض خواہوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا دشوار ہوگیا تھا۔ (ملاحظہ ہو تفسیر طبری، صحولہ بالا، ج ۶ ص ۲۲ تا ۲۴)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، تحریم ربوا کے سلسلے کی آیات میں سورۂ آل عمران کی آیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس میں ربوا کی یہی بنیادی علت یعنی "اضعافا مضاعفۃ" چندر در چند ہوجانا بیان کی گئی ہے طبری نے مشہور تابعی مفسر قرآن حضرت مجاہد رح سے روایت کی ہے کہ یہی اضعافا مضاعفۃ ہونے والا سود ربا الجاہلیۃ تھا، متن عبارت درج ذیل ہے:۔

ظاہر ہے، فقہ کے مسلمہ اصولوں کی بنیاد پر اس سے ہرگز ہرگز یہ لازم نہیں آسکتا کہ یہ چونکہ زیادہ مقدار میں حرام کیا گیا ہے اس لئے کم مقدار میں جائز ہے۔

بادہ کشیدن منع است بادہ چشیدن رواست

آیت لاخیر کثیر من نجواھم سے یہ نتیجہ کون احمق نکالے گا کہ نجویٰ اگر زیادہ ہو تو برا ہے ورنہ پھر اچھا۔ لاتشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا کے معنی یہ کیسے لئے جاسکتے ہیں کہ اگر دین فروشی کا دھندا کم داموں ہو تو حرام ہے اور اگر دو ہزار روپے مہینہ ملے تو حلال وطیب۔ اجتنبوا کثیرا من الظن سے قلت ظن کے لئے جواز کس طرح پیدا ہوسکتا ہے ولاتکرھوا فتیٰتکم علی البغاء ان اردن تحصنا (اپنی لونڈیوں کو زنا کرانے پر مجبور کرو جبکہ وہ پاکدامن رہنا چاہیں) سے کیا کوئی بڑے سے بڑا فاسق وفاجر بھی یہ نتیجہ نکالے گا کہ اگر لونڈیاں برضا ورغبت زنا کرانے پر تیار ہوجائیں تو پھر شرعاً چکلے میں بٹھا کر حیاۃ الدنیا کے مزے لوٹے جاسکتے ہیں۔ الذین یکتبون الکتاب بایدیھم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا۔ سے کیا ڈاکٹر صاحب یہ سمجھ بیٹھے ہیں جب پیسے زیادہ ملیں تو اللہ کی کتاب کے حوالے سے جو بھی لکھ ماریں گے ثواب مل جائیگا۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔[۵۱]

---

۵۱ قیاس مع الفارق FALLACIOUS ANALOGY کی اس سے بدتر مثالیں ملنا مشکل ہے ظاہر ہے کہ ربوا لین دین کی ایک شکل ہے اس کی مثال دینی ہی ہے تو لین دین کی مختلف شکلیں ہی سے دی جاسکتی ہے۔ مثلاً تجارت میں معقول حد تک یعنی معقول شرح کے اندر نفع لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے لیکن معقول شرح سے باہر نفع لینا نفع خوری، منافع بازی PROFITEERING اور چور بازاری ہے اور سوسائٹی کے خلاف ایک بڑا جرم جس پر حکومت مواخذہ کرسکتی ہے اور کرتی ہے۔ اسی طرح تجارت کیلئے معقول حد تک مال جمع رکھنا

حدثنا محمد بن عمرو قال حدثنا أبو عاصم عن عیسیٰ عن ابن ابی نجیح عن مجاھد فی قول اللّٰہ عزوجل یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفۃ ربا الجاھلیۃ ۔ (تفسیر الطبری، ج ۷، ص ۲۰۴)۔

اسی ام التفاسیر میں دوسرے مشہور تابعی مفسر حضرت زید بن اسلم رح سے جو اثر مروی ہے اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ

جاہلیت کے ربٰوا کی خصوصیت اس کا چند در چند ہونا (تضعیف) تھا۔

اس اثر میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ تضعیف کا یہ عمل مال و زر اور جانوروں کے قرض کے معاملے میں کس طرح کارفرما ہوتا تھا۔ اس کی پوری عبارت درج ذیل ہے :۔

حدثنی یونس قال اخبرنا ابن وھب قال سمعت ابن زید یقول فی قولہ ۔ "لا تاکلوا الربٰوا اضعافا مضاعفۃ" قال کان ابی یقول انما کان الربا فی الجاھلیۃ فی التضعیف وفی السن ۔ یکون للرجل فضل دین فیاتیہ اذا حل الاجل فیقول لہ : تقضینی أو تزیدنی فان کان عندہ شئ یقضیہ تضی والا حولہ الی السن التی فوق ذلک ان کانت ابنۃ مخاض یجعلھا ابنۃ لبون فی السنۃ الثانیۃ ثم حقۃ ثم جذعۃ ثم رباعیا ثم ھکذا الی

سبحان اللہ! کیا یہی وہ تاریخی شہادت ہے جس سے اصل زر دوگنا چوگنا ہونا قرار پا رہا ہے[١١]؟ اگر کسی شخص میں ذرا بھی ہوش و حواس باقی ہے تو وہ اس اثر سے یقیناً یہ نتیجہ نکالے گا کہ پہلی مدت کے اختتام پر دوگنا چوگنا سود تو کجا برائے نام سود کا لین دین بھی نہیں ہے۔ البتہ عدم ادائیگی کی صورت میں اسی طرح سود عائد کیا جا رہا ہے جس طرح آجکل تعزیری سود عائد ہوتا ہے۔ اور یہ نتیجہ نکالنے والا کسی غلط فہمی کا ارتکاب نہیں کریگا کیونکہ یہ طریقہ صرف قریش ہی میں نہیں، بلکہ دور دور عمل میں لایا جاتا تھا یہودیوں کے تو ڈاکٹر صاحب خاص طور سے نیاز مند ہیں اور اپنی خرافات کا ایک مجموعہ بھی مر ہنائے عشق و عقیدت ایک یہودی نژاد سے معنون کر چکے ہیں۔ اگر یہودی مورخ کو خط لکھ کر یہودیوں کے ابتدائی طرز عمل کے بارے میں فتویٰ لے لیتے تو شاید اس اینچ اور کٹ حجتی کی ضرورت پیش نہ آتی۔

پھر طرہ یہ کہ جو سیدھا سادہ مفہوم اس روایت سے مولانا مودودی نے لیا ہے، اس کو آپ محض "قیاس" قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ان کے اس قیاس کو عقل تسلیم نہیں کرتی"۔ جی ہاں آپ کی باریک عقل میں مودودی صاحب کی یہ موٹی سی بات کیسے سمائے گی جبکہ وہ بحمد اللہ مسلمان ہیں اور اسلامی معیار رکھتے ہیں۔ رسول صحابہ رسول اور محدثین علماء اور فقہاء کا احترام کرتے ہیں اور ان کے خزانوں میں سے اخذ کرتے وقت دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔ آپ کو تو صرف وہ بات قابل قیاس اور معقول

فوق و فی العین یاتیه فان لم یکن عنده أضعفه فی العام القابل فان لم یکن عنده اضعفه ایضا فتکون مئة فیجعلها الی قابل مئتین فان لم یکن عنده جعلها اربعمئة یضعفها له کل سنة أو یقضیه قال فهذا قوله لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفة

(تفسیر الطبری، ج ۷، ص ۲۰۶ تا ۲۰۵)

اوپر کی بحث سے ظاہر ہوا کہ زمانہ جاہلیت کا ربوا کا معاشی نظام کتنا جابرانہ تھا کہ سو کے اگلے سال دو سو اور اس سے اگلے سال چار سو اور پھر سولہ سو اسی طرح اضعافا مضاعفة ہوتے جاتے تھے کہ بیچارہ قرض دار ادا کرتا رہتا تھا پھر بھی راس المال (زر اصل) تو الگ رہا، سود بھی ادا نہ ہو پاتا تھا۔ یہی جاہلیت کا ربوا تھا جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے اور جسے روا رکھنے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

نظر آتی ہے جو عیسائیوں اور یہودیوں کی "گل افشانی" کا نتیجہ ہو۔ خیر صاحب ہم آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ایک یہودی زادے ہی کا اقتباس پیش کئے دیتے ہیں۔ "یہودیوں کی سماجی اور مذہبی تاریخ" کا مصنف سالو وٹ میئر بیرن (SALO WITTMAYER BARON) کتاب مطبوعہ ۱۹۵۸ء کے پہلے حصہ میں صفحہ ۲۶۱ پر کہتا ہے:۔

"روم میں (دوسری صدی قبل مسیح میں۔ راقم) اسٹیٹ بنک بھی قائم تھے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بہت سے یہودی ملازم تھے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ غیر سودی قرض کے جو معاہدے ملتے ہیں ان میں یہودیوں کے سود سے نفرت کے جذبہ کا اثر منعکس ہے۔ معاملہ جو بھی ہو بہرحال ۱۸۲ ق م کا ایک معاہدہ یہ صراحت کرتا ہے کہ ایک سال تک کوئی سود نہیں لیا جائیگا۔ بلکہ اگر اس نے حسب قرار داد ادا نہ کیا تو ساستیتس اپولونیٹس کو ڈیڑھ گنا قرض اور مزید مدت کے لئے ایک منا پر دو درہم ماہانہ (۲۴ فیصد) کے حساب سے سود ادا کرے گا۔ یہی رائج الوقت نرخ ایک دوسرے معاہدے میں بھی نظر آتا ہے جو ۱۷۴ء میں دو یہودیوں کے درمیان قرار پایا تھا..... بہرحال صورت جو بھی ہو قرض پہلی مرتبہ بغیر سود کے ہی دیا جاتا ہوگا۔ البتہ یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ جب یہودی ایک پیشہ ور گروپ کی حیثیت سے سامنے آ گئے تو پھر وہ اس نوعیت سے وابستہ نہ رہے چاہے وہ مصر کے قرض دہندہ ہوں یا کوئی اور۔"

(صفحہ ۲۶۱)

ملاحظہ فرمایئے یہ واقعہ اسلام سے آٹھ سو سال پہلے کا ہے اور عرب کا نہیں بلکہ بازنطینی سلطنت

زمانے ہی میں نہیں بلکہ سینکڑوں سال پہلے سے تھی۔ یعنی یہ کہ قرض دے کر پہلی مدت کے خاتمہ تک سود نہ لینا[۱۷]

اب رہا یہ امر کہ "آیا وہ لوگ جو سود کے دو سو اور پھر اگلے سال چار سو" کرنے والے ہوں پہلی مرتبہ کا قرض محض حسبۃ للہ دیدیں کس طرح ممکن ہے؟ سو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جناب نے پہلے ہی کیوں ایسا لغو اور نامعقول دعوے کیا جس کے بعد کسی روایت اور کسی تاریخی شہادت کو اس کے الفاظ کے اصلی مفہوم میں سمجھنا بعید از قیاس نظر آنے لگے۔ آپ کے نزدیک تو پانچ فیصدی سود ضرور حلال ہے۔ اگر کسی دوست کو قرضہ دیتے ہیں تو کیا آپ اس سے سود وصول کرتے ہیں؟ قبل اسلام کے عرب تو غیر مشرک تھے پھر بھی سود کو نجس سمجھتے تھے اور تعمیر کعبہ کے لئے سود اور رنڈی کی کمائی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ تو حلال سمجھتے ہیں کیا آپ اپنے دوست سے اس شرعی حق کا تقاضہ فرماتے ہیں؟ اور اگر نہیں لیتے تو کیا آپ کا رویہ بھی ناقابل قیاس قرار پائے؟

یہ ایک ایسی گتھی تھی جس کو سلجھانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے خوب ہی "سائنٹفک طریقہ" اختیار کیا۔ اگر آپ امام

---

[۱۷] سالو وٹ میر بیرن SALO WITTMAYER BARON کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ اس تبصرہ کے آخر میں درج ہے اسے مجھی صاحب کے ترجمے کے ساتھ ملا کر پڑھئے اور دیکھئے کس طرح مطلب کچھ کا کچھ کر دیا گیا ہے۔ بیرن کے قول کا خلاصہ تو یہ ہے کہ یہودی اپنے قرون اولیٰ میں ربوٰی کا روبار کرتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ ایڈلر کے مخطوطوں میں قرض کے بعض بیان کے ایسے کاغذات ملے ہیں جن میں بغیر کسی سود کے قرض دیا گیا ہے۔ البتہ دو مخطوطے ایسے ملے ہیں جن میں یہودی قرض خواہ نے بازنطینی دور کی مروجہ شرح کے مطابق سود لینے کی شرط رکھی ہے وہ بھی صرف اس صورت میں جبکہ مقروض سال بھر کے بعد قرض واپس نہ دے سکے۔ بیرن یہ بھی بتاتا ہے کہ شروع زمانہ کے یہودیوں میں قاعدہ یہ تھا کہ اگر قرض خواہ چھ سال تک قرض واپس نہ لے سکے تو ساتویں سال قرضہ آپ سے آپ معاف ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ساتواں سال سبت کا سال سمجھا جاتا تھا۔ یہ ساری صورت حال اس زمانے کی ہے جبکہ یہودی ساہوکارہ نہیں کرتے تھے جب وہ ساہوکارہ کرنے لگے تو انہوں نے یہ سب رعایتیں ترک کر دیں۔ کیونکہ بیرن کے قول کے مطابق ساہوکار بننے کے بعد پہلے سال یا کسی سال بغیر سود کے قرض دینے کا بغیر نفع کا سودا PROFITLESS TRANSACTION بھلا وہ کیوں کرتے؟

بیرن کی اصل عبارت پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اس اقتباس سے ڈاکٹر صاحب کی بلکہ یوں کہئے کہ عقل سلیم کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اثنائے کلام میں ایک فقرہ یہ موجود تھا کہ "ایک سال تک سود نہیں لگے گا" اس لئے اس کی خاطر ساری عبارت کو مسخ کیا گیا۔ لیکن اس کی شکایت کیا کی جائے۔ جب کہ تفسیر میں تحریف کی جا سکتی ہو (ملاحظہ ہو حاشیہ ۵) تو یہ تو آخر ایک "یہودی زادے" کی تحریر تھی۔ (سالو وٹ میر بیرن کی اصل عبارت اور ترجمہ کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ۸۶ و ۸۷)

مالک کی روایت پیش کرنے کے فوراً بعد لکھتے کہ اس اثر سے جسے فلاں فلاں ائمہ حدیث وفقہ نے بھی نقل کیا ہے یہ ظاہر ہے کہ پہلی مدت کا یہ سود ربوٰا نہیں سمجھا جاتا تھا. ربا راس المال میں اضافہ تھا جس سے چند الٹ پھیر میں اصل زر کئی گنا ہو جاتا تھا. واقعہ یہ نظر آتا ہے کہ ابتداءً کچھ رقم مقررہ میعاد تک کے لئے سود پر قرض دی جاتی میعاد کے اختتام پر اگر قرض دار رقم ادا نہ کر سکتا تو بنیادی قرض یعنی راس المال میں کافی اضافہ کر کے مدت ادائیگی میں توسیع کر دی جاتی "(ص۵۸) تو ظاہر ہے کہ پڑھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا کہ آخر میکیگل کے اس فاضل نے موطا کی روایت سے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کر لیا اور اسے تاریخی بنا کر پیش کر دیا چنانچہ ایسا کرنے کے بجائے آپ نے پہلے تو مولانا مودودی کے اخذ کردہ سیدھے سادے نتیجے کو پیش کر کے اسے اپنے قیاس کے خلاف قرار دیا لیکن انہیں یقین تھا کہ اس بے دلیل یاوہ گوئی کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا اس لئے ضروری تھا کہ کسی محترم شخصیت کو بیچ میں ڈال کر مشکل کو حل کیا جائے اور نکتہ آفرینی فرمائی جائے کہ دیکھو اس کمترین کی بات کا اگر یقین نہ آئے تو مفتی شفیع صاحب کی بات کا تو یقین کرو ان جیسا خدا ترس عالم دین بھی مودودی صاحب کی رائے کو مردود قرار دے رہا ہے اور وہ احمقانہ نتیجہ نہیں نکالتا ہے جو مودودی نے اختراع کیا ہے. لہٰذا مودودی صاحب کی کم عقلی مفتی صاحب نے ہی واضح کر دی اس لئے ان کا پتہ تو اس طرح کٹ گیا اب رہا مفتی صاحب کا بیان تو بھلا کہاں مفتی شفیع صاحب اور کہاں امام مالک، ان کی روایت سے جسے فلاں فلاں "ائمہ حدیث وفقہ نے بھی نقل کیا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ....." لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے اپنی کتاب میں مختلف روایتیں بہت ہی احتیاط کے ساتھ پیش کی ہیں اور ان سب سے جو جو نتائج نکل سکے ہیں انھیں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے. اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب نے مختلف روایتیں اور ان کے نتائج سامنے رکھے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ رائے بھی دی ہے کہ:

> "اس ربا کی مختلف صورتیں مختلف خطوں میں رائج تھیں عرب میں اس کا اکثر رواج اس طرح تھا کہ ایک معین رقم معین مدت کے لئے معین مقدار سود پر دیدی جاتی تھی قرض خواہ نے اگر میعاد مقررہ پر واپس کر دی تو مقررہ سود لے کر معاملہ ختم ہو گیا اور اگر اس وقت واپس نہ کر سکا تو آئندہ کے لئے مزید سود کا معاملہ کیا جاتا تھا. بہرحال ربا کی حقیقت جو نزول قرآن سے پہلے سمجھی جاتی تھی یہ تھی کہ قرض دے کر اس پر نفع لیا جائے" (ص۹-۱۰)

لیکن واہ رے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ان کو اس عبارت کا نہ تو شروع کا حصہ نظر آیا اور نہ آخر کا[18] اور نہ ہی دوسری

[18] مفتی محمد شفیع صاحب کی جو عبارت ڈاکٹر صاحب نے نقل کی تھی اس کے شروع اور آخر میں ایک ایک غیر متعلق جملہ اور نقل کر دینے سے نفس مضمون میں کیا فرق پڑا؟ کیا اب یہ نتیجہ نکلا کہ مفتی صاحب بھی مودودی صاحب کی طرح اس امر کے قائل ہیں کہ [illegible]

مختلف روایتیں نظر آئیں البتہ آپ نے اپنے استادوں کی سی عیاری سے کام لیتے ہوئے مودودی صاحب کی موطا والی رائے کو مفتی محمد شفیع صاحب کے نکالے ہوئے نتیجہ سے ٹکرا دیا اور پھر علماء کے اختلافات کے پیش نظر قاضی القضاۃ بن کر جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ افسوس مودودی صاحب اور مفتی صاحب کے یہاں علمی دیانت کام کر رہی ہے لیکن اس ناقص کے یہاں ذہنی دیانت۔

ان محترم المقام علماء سے حد سے حد اگر کوئی تسامح ہوا ہے تو وہ صرف اس قدر کہ ان کی تحریر میں سود کی کسی ایک شکل کو متعین کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے حالانکہ کسی ایک مقام پر ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ شکلوں میں سود رائج ہو سکتا ہے[۱۹]۔ دور کیوں جائیے خود آج ۱۹۶۳ء کی مثال لے لیجئے۔ فرض کیجئے آپ کے پاس مختلف روایتیں آتی ہیں۔

زید کی روایت ہے کہ اس نے ایک ضرورت پر اپنے بینکر سے اوور ڈرافٹ وصول کیا اور چھ فیصد سالانہ کے حساب سے اگلے ماہ سود ادا کر دیا۔

عمر نے کہا کہ جب میرا مال باہر سے آنے لگا تو میں نے اسے چھڑانے کے لئے دو ماہ کے لئے سات فیصدی پر قرض لیا۔

بکر سے روایت ہے کہ اس نے تعمیر مکان کے لئے قرض لیا اور بارہ سال تک ماہانہ قسطوں میں دس ہزار کے بجائے بیس ہزار ادا کئے۔

ساجد سے روایت ہے کہ اس نے پانچ ہزار روپیہ اپنی دکان کے لئے بغیر سود کے قرض لیا۔

داؤد کی روایت ہے کہ اسے اپنے کارخانے کی توسیع کے لئے زر مبادلہ قرض لینے کی ضرورت پیش آئی اور اس نے ۲½ فیصد پر قرض لیا۔

احمد سے روایت ہے کہ اس نے ۱۰ فیصدی سود پر ایک رفریجریٹر ادھار لیا۔

سلیم سے روایت ہے کہ اس نے کاشت کے سلسلے میں سوسائٹی سے گیارہ فیصد سود پر قرض لیا۔

اسٹیٹ بنک کا ایک اعلامیہ مظہر ہے کہ بنک کی شرح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور حسب سابق چار فی صدی رہی۔

---

[۱۹] زمانۂ جاہلیت میں ربوا کی ایک اور صرف ایک شکل رائج تھی جس کا ذکر قرآن لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفۃ میں کیا ہے۔ اور جس کی تاریخی شہادتیں ڈاکٹر صاحب نے حضرت مجاہد رح اور حضرت زید بن اسلم رح کی روایتوں سے پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور شکل یا شرح کے زمانۂ جاہلیت میں رائج ہونے کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ اسی لئے محترم المقام علماء نے یہ دعویٰ اب تک نہیں کیا کہ زمانۂ جاہلیت میں کئی طرح کا سود رائج تھا جیسے عجمی صاحب ان علماء کا

اوپر کی روایات ملاحظہ فرمایئے تمام روایات ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود امر واقعہ ہیں اور ایک ہی مقام پر ایک ہی وقت میں صحیح ہیں لیکن ذرا ڈاکٹر کے ذہن سے غور فرمایئے۔ اب دیکھئے ان روایات میں کتنا شدید معارضہ ہے اور یہ کس قدر ناقابل قیاس نظر آتی ہیں۔ مختلف راویوں کی مختلف حالات کی روایات تو کجا یہاں تو ایک ہی راوی اس قدر مختلف بیان دیتا نظر آرہا ہے۔ کبھی سود ہی سرے سے نہیں ہے کبھی ۶ فیصد کسی روایت میں ۷ فیصد کہیں ۱۱ فیصد، اللہ رے اختلافات، حالانکہ سرکاری شرح سود واضح طور سے ۴ فیصد بتائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اسٹیٹ بنک نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا ہوگا اور جب اسٹیٹ بنک کا بیان مستند ہے تو پھر ۴ فیصدی ہو یا چھ اور سات فیصدی اور یا ۱۰-۱۱ فیصدی سب جھوٹ ہے۔ پھر معارضہ صرف شرح سود کے اظہار میں ہی نہیں بلکہ قرض کی نوعیت میں بھی نظر آرہا ہے کسی روایت میں درآمد لیئے ہے کہیں مکان بنانے کے لئے کسی روایت میں رفریجریٹر ادھار خریدا گیا ہے تو کہیں اوور ڈرافٹ، اللہ اللہ پھر کہیں مدت تین ماہ بتائی گئی ہے اور سود صرف بارہ روپے تو کہیں مدت دس سے تیرہ سال تک ہے اور سود اصل زر سے دگنا یعنی دس ہزار کا بیس ہزار۔ اللہ اکبر کیا آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ ——— ایسا ممکن ہے جی ہاں یہ سب روایتیں آج کے لحاظ سے بالکل بجا ہیں البتہ اگر احادیث یا آثار میں ایسے مختلف بیانات ہوتے تو ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وہ سب ارتقائی کرشمے قرار پاتے یا غیر مہذب الفاظ میں مولویوں کی ۴۲۰۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب نے دو چند سہ چند سود پر کیسے اتنی واویلا مچا رکھی ہے جبکہ آج اسی ۱۹۶۳ء میں امریکہ کی بعض ریاستوں میں خالص قانونی شرح کے لحاظ سے سود دو سال کے اندر اندر اصل زر کے برابر ہو جاتا ہے اور خود ہمارے ملک میں کم سے کم چار سال میں۔ اور یہ شرح سود تجارتی اور نفع بخش قرضوں کے لئے نہیں بلکہ ضروریاتی قرضوں اور چھوٹے چھوٹے قرضوں کی شرح ہے۔ یہ عمل تضعیف جس طرح آج ہوتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی تھا۔ آخر اسلام نے اسے حرمت کی شرط کہاں قرار دیا ہے۔ آج بھی اگر کوئی کاشتکار سرکاری رعایتی شرح پر قرض لیتا ہے تو تیرہ سال میں ایک ہزار کے تین ہزار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر سود مفرد کا حساب لگایا جائے تو دو چار سال مزید تاخیر سے[۲۰]

(باقی آئندہ)

---

[۲۰] عمل تضعیف حرمتِ ربوا کی علت ہے، قرآن حکیم کی آیت، اس کی شارح تاریخی شہادتوں اور قرونِ اولیٰ کے مفسروں کی تفسیری روایات کی رُو سے۔ قرض کے جس کاروبار میں جس قدر جلد عمل تضعیف کا نفوذ ہوگا، وہ کاروبار اسی قدر زیادہ ربوا کے قریب ہوگا۔

ضمیمہ

سالو وٹ میر بیرن کی کتاب "یہودیوں کی مذہبی اور معاشرتی تاریخ" A SOCIAL AND RELIGIOUS HISTORY OF THE JEWS جلد اوّل صفحہ ۲۶۱ (مطبوعہ نیویارک ۱۹۵۲ء) کا اقتباس اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :-

"Curiously, banking, which in later ages was to become a characteristically Jewish occupation, still attracted but few Jews. Among the considerable number of bankers in Graeco-Roman Egypt listed by Calderini not one name could be safely identified as Jewish although a number of Jews seem to have served as officials in state banks. It has even been suggested that the loan contracts without interests included in the Adler papyri reflected the influence of Jewish aversion to usury. Be this as it may, one Tebtunis papyrus of 182 B.C.E., recording a mortgage loan between two Jews, specifically provided that no interest was to be paid for a year. Only "if he does not repay it as stated, Sostatus shall forthwith forfeit to Apollonius the loan increased by one-half and for the overtime interest at the rate of two drachmas per mina per month." The same fairly customary rate of 24 per cent is recorded also in another loan contract between two Jews of Tebtunis (of 174 B.C.E.). However, here, too, we deal with the renewal of the loan, further complicated by the prospect of repayment in "the eighth year", which may have had some bearing on the legal cancellation of debts during the Jewish Sabbatical year. In any case, the original loan may have been granted without interest. It stands to reason, however, that once they became a professional group, the Jewish moneylenders in Egypt and elsewhere could not long indulge in such profitless transactions."

ترجمہ

عجیب بات یہ ہے کہ ساہوکارہ جو بعد کے زمانے میں یہودیوں کا مخصوص پیشہ بننے والا تھا، اس وقت تک (یعنی دوسری صدی قبل مسیح تک) محض چند یہودیوں کو اپنی طرف مائل کر سکا تھا۔ کالڈرینی نے یونانی رومی عہد کے مصر کے ساہوکاروں کی جو خاصی لمبی فہرست دی ہے، اس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی نام ایسا نہیں ملتا جسے صحیح معنوں میں یہودی نام کہا جا سکے، گرچہ ساہوکارے کے سرکاری دفتروں میں شاید متعدد یہودی اہلکار ملازم تھے۔ ایڈلر کے مصری مخطوطوں میں سود کے بغیر قرضوں کے جو تمسکات ملے ہیں، ان کے بارے میں بھی خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ان کا سود سے پاک ہونا یہودیوں کے ربوی کاروبار سے نفرت کے زیر اثر ہے۔ بایں ہمہ ۱۸۲ء قبل مسیح کا ایک تبتونس مصری مخطوطہ ملا ہے جس میں دو یہودیوں کے درمیان رہن پر قرض کے لین دین کا معاملہ درج ہے اور متعین طور پر یہ شرط موجود ہے کہ ایک سال تک سود نہیں لگے گا۔ (معاہدے کے اپنے لفظوں میں) "اگر مقروض مسمّی سوستاتس معینہ میعاد میں قرض ادا نہ کر سکا تو صرف اس صورت میں وہ اپنے قرضخواہ مسمّی اپولونی اس کے حق میں قرض کی رقم کی بقدر نصف زیادتی کا تاوان ادا کرے گا اور مزید تاخیر کے لئے فی مناد دو درہم ماہوار کے حساب سے سود دیگا۔" ۲۴ فی صد کی اس زمانے کی یہ خاصی مروجہ شرح تبتونس ہی کے ۱۷۴ء قبل مسیح کے دو اور یہودیوں کے درمیان قرض کے تمسک میں درج ہے۔ بہرحال، اس تمسک میں بھی قرض کی تجدید کا ذکر ہے، جسے "آٹھویں سال میں" قرض کی بازادائیگی کی شرط نے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس شرط کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہودی قانون کی رو سے یہودیوں کے سبت کے سال میں تمام قرضے ساقط ہو جاتے تھے۔ بہرصورت، اصل قرض شاید بغیر سود کے ہی دیا گیا ہو۔ لیکن قرین عقل یہ ہے کہ جب مصر اور دوسرے ممالک میں یہودی قرض خواہ پیشہ ور ساہوکار بن گئے تو اس طرح کا بغیر منافع کا دھندا زیادہ دیر تک نہ چلا سکے ہوں گے۔